

ابن خواہش فخر المشائخ حضرت صاحبزادہ میان جمیل احمد شرقتوری اٹل کابھم

نامہ نور اسلام شرقتور شریف کے معروف سلسلہ مضامین "امراء بر در نقباء"  
سے ان مضامین کا انتخاب جن کا تعلق آستانہ عالیہ شرقتور شریف سے ہے

# ضیاء الفقراء

کاوش: جناب محمد انور فخر شرقتوری

ترتیب:

محمد حسین قصوری نقشبندی

ناشر

الکادریہ علیہ السلام ● والٹن روڈ، لاہور

86575

69488

## جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں

نام کتاب \_\_\_\_\_ ضیاء الفقراء  
 کاوش \_\_\_\_\_ جناب محمد انور فخر شریقی  
 ترتیب \_\_\_\_\_ محمد حسین قصوری نقشبندی  
 اشاعت (اول) \_\_\_\_\_ اکتوبر ۱۹۹۷ء  
 تعداد \_\_\_\_\_ گیارہ سو  
 ناشر \_\_\_\_\_ ادارہ علم و ادب، والٹن روڈ، لاہور

کمپوزنگ : \_\_\_\_\_ الممالک کمپوزر سرور مارکیٹ اردو بازار لاہور  
 قیمت \_\_\_\_\_ 60/-

رابطہ بذریعہ ڈاک \_\_\_\_\_ مکان نمبر E31 میجر طارق شریف شہید سٹریٹ  
 TORI النور ٹاؤن درکشاپ سٹاپ، والٹن روڈ لاہور کینٹ  
 فون : 5813070

### کتاب ملنے کے پتے

- ۱۔ مکتبہ شیر ربانی، کاشانہ شیر ربانی نزد داتا دربار، لاہور
- ۲۔ کرم پبلی کیشنز، سرور مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
- ۳۔ ضیاء القرآن پبلیکیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور
- ۴۔ مکتبہ قادریہ، داتا دربار روڈ، لاہور
- ۵۔ مکتبہ فاروقیہ رضویہ، گوجر پورہ، باغبان پورہ، لاہور
- ۶۔ مکتبہ اشرفیہ، مرید کے، ضلع شیخوپورہ
- ۷۔ مکتبہ نوریہ، قصور



## فہرست مضامین

صفحہ	نمبر شمار	مضمون
4	1	تسمیہ
5	2	اسم ذات
6	3	اسم پاک
7	4	بلغ العلاء بکمالہ
8	5	نقش اول
12	6	رت جگوں کے تحفے
16	7	”حرف تعارف“
22	8	اللہ ہو
39	9	تبادلہ قسمت
52	10	نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
67	11	ایک مرد درویش پولیس افسر
86	12	دامن فیض عام
98	13	تکمیل آرزو
112	14	دور بین
123	15	کنارا بھی سہارا بھی
143	16	نعت کی برکتیں
159	17	تعمیر مسجد کے لئے ایک روپیہ
169	18	لباجی
179	19	معالج

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

گوشتی





قطعہ اسم ذات جو اعلیٰ حضرت شیر ربانی حضرت  
 میاں شیر محمد شرق پوری عزاۃ اللہ نے اپنے دست مبارک  
 سے رسم فرمایا جس سے آپ کے عشق الہی کا بخوبی  
 اندازہ ہوتا ہے، پتے پتے میں اسم ذات نہایت  
 خوبصورتی سے واضح کیا گیا ہے۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَقَدْ جَاءَكَ فَتْرَةٌ فَاتَّقِ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ  
 فَاتَّقِ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ  
 فَاتَّقِ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ خَشِيعًا  
 قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ خَشِيعًا  
 قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ خَشِيعًا

رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ

لَقَدْ جَاءَكَ فَتْرَةٌ فَاتَّقِ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ  
 فَاتَّقِ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ  
 فَاتَّقِ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ



تَلَعَّ الْعُلَى بِحَمَالِهِ  
كَشَفَ اللَّهُ بِحَمَالِهِ  
خَسَنَتْ عَمِّعُ خِصَالِهِ  
صَلُّوا عَلَى وَآلِهِ

غُلَامُكَ تَلَعَّ نَزَقَ بَسْمُ

## نقش اول

فخرالمنشخ حضرت صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب دامت برکاتہم شریپوری کی زیرادارت شائع ہونے والا ماہ نامہ ”نور اسلام“ شریپور شریف اپنی اشاعت کا بیالیسواں سال مکمل کر رہا ہے۔ صاحبزادہ صاحب کی ابتداء سے اب تک یہی کوشش رہی ہے کہ اس کا ہر شمارہ پہلے سے بہتر اور منفرد ہو۔ علاوہ ازیں اس کے حلقہ تحریر میں نئے لکھنے والے اور بہتر لکھنے والے شامل ہوتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی صحافت کی صف اول میں ماہنامہ ”نور اسلام“ شریپور شریف کا شمار ہونے لگا ہے۔

مارچ 1990ء میں ”نور اسلام“ نے ایک نئے سلسلہ مضامین کا آغاز کیا جو آج تک بفضلہ تعالیٰ چل رہا ہے۔ اس سلسلہ مضامین میں ”امراء برادر فقیر“ کے عنوان سے بزرگان دین کے سوانح میں سے ان واقعات کو لیا گیا جن کے تحت کوئی امیر یا امیرزادہ اللہ تعالیٰ کے (اولیاء) فقیروں کی بارگاہ اقدس میں آیا اور من پسند انعامات سے جھولیاں بھر کے واپس لوٹا۔

تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے یہ باتیں کوئی نئی نہ تھیں مگر علامہ محمد انور قمر شریپوری صاحب نے ان واقعات کو ایک نیا انداز دیا ہے۔ یہ ایسا تھا جو نور اسلام کے قارئین کو بے حد پسند آیا۔ یہاں تک کہ نئی دہلی (بھارت) میں کثیرالاشاعت ماہ نامہ ”الہدی“ اسلامی ڈائجسٹ نے اپنے مستقل عنوانات میں اس سلسلہ کو شامل کر لیا۔

اس سلسلہ مضامین میں علامہ صاحب کے قلم سے ایسے مضامین بھی لکھے گئے جن کا تعلق آستانہ عالیہ شریپور شریف سے تھا۔ ایسے مضامین کی تعداد دس گیارہ تک پہنچ



چکی ہے۔

جب بابو خدا بخش (ایک مرد درویش پولیس افسر) کے بارے میں مضمون چھپا تو فخرالمنش حضرت صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی کہ اس مضمون کو الگ چھاپ کر پولیس کے مختلف دفاتر میں بھیجا جائے کہ شاید اس نفسانفسی کے عالم میں کئی دوسرا پولیس افسر بابو خدا بخش کی زندگی کو اپنا سکے۔

میاں صاحب نے فرمایا ”ہاں ایسا ہو سکتا ہے“ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ”امراء بر در فقراء“ کے تحت چھپنے والے ایسے سب مضامین کو کتابی شکل میں کر دینا چاہیے جن کا تعلق آستانہ عالیہ شرقپور شریف سے ہے۔

میں تو سمجھتا ہوں یہ حضرت میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری کی کرامت سمجھی جائے گی کہ اکتوبر 1996ء کو بابو خدا بخش والے مضمون کو الگ چھاپ دینے کی سعادت ملک نور الہی صاحب ڈاکٹر شرقپوری کے حصے میں آئی۔ اور آستانہ عالیہ شرقپور شریف سے تعلق رکھنے والے مضامین کو ایک مختصر کتاب میں پیش کرنے کی سعادت میرے حصے میں آرہی ہے۔

اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرقپوری کے تذکروں میں ان مضامین کے اجمالی حالات ملتے ہیں۔ مگر محمد انور قمر صاحب شرقپوری نے تو کمال ہی کر دیا ہے کہ انہوں نے صاحب واقعہ سے متعلق (ان کے بیٹے پوتے نواسے یا اس کے کسی عزیز) سے مل کر زیادہ سے زیادہ صحت مند معلومات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ صاحب ایک صاحب طرز انشاء پرداز ہیں انہوں نے ہر بات کے لیے نہایت



موزوں الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے ان مضامین کا لکھا ہے۔۔۔ دسمبر 1996ء میں شرقپور شریف میں میری ان سے ملاقات ہوئی اس ملاقات اور تعارف کا باعث بھی یہی مضامین بنے۔ ماہ نامہ ”نور اسلام“ میں امراء بر در فقراء کو پڑھتا تو اس صاحب قلم سے ملنے کو جی چاہتا۔ اور پھر یہی شوق اور جستجو مجھے ان کی چوکھٹ تک لے گئی۔ انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنے اخلاص اور اخلاق سے نہایت متاثر کیا اور اپنے پیار بھرے دل میں مجھے بھی جگہ دیدی۔ اور میری کتاب چشمہ فیض شیربانی کی تکمیل میں خاصی مدد کی۔

مسلک کے اعتبار سے آپ نقشبندی مجددی ہیں اور فخرالمنان حضرت صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری کے حلقہ ارادت میں داخل ہیں۔ آپ کے حالات پر حضرت میاں صاحب کی خاص توجہ ہے۔ اہل سنت کے مصنفین کی معروف تنظیم پاکستان سنی رائٹرز گلڈ (رجسٹرڈ) کے فعال رکن اور سیکرٹری نشر و اشاعت رہ چکے ہیں۔

اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرقپوری اور حضرت قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق وہ مضامین جو رسالہ ”نور اسلام“ میں امراء بر در فقراء کے عنوان سے چھپے انہیں کتابی شکل میں پیش کر کے ان سینکڑوں متوسلین آستانہ عالیہ شرقپور شریف اور قارئین ماہ نامہ ”نور اسلام“ کے خطوط کی فرمائش کی بجا آوری ہے جنہوں نے اپنے شوق مطالعہ کے پیش نظر اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان مضامین کو کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔

اس طرح اس کتاب کی وساطت سے آپ کو دوبارہ ان مضامین کو پڑھنے کا موقع مل



رہا ہے جن کو آپ ماہنامہ ”نور اسلام“ شرقپور شریف کے صفحوں میں پڑھ چکے ہیں۔

طالب دعاء

محمد یسین قصوری نقشبندی

نزیل لاہور

اکتوبر ۱۹۷۷ء

هو الغفور  
٤٨٦-٩٢

## رت جگوں کے تحفے

میری آنکھ نے وہ جلوہ نہیں دیکھا۔ اگر وہ جلوہ ء زیبا پیش نظر ہوتا تو فارجمع البصر کے حکم کی تعمیل میں اسے بار بار دیکھتا۔ کہ نظر کی تکرار بھی نظر کو گہرائی میں لے جاتی ہے۔ محبوب کی دید نہ ہو تو اس سے اندھا ہونا زیادہ بہتر ہے۔ الحمد للہ میں ان اندھوں میں نہ ہوا، جن کی آنکھیں بھی تھیں، روئے زیبا بھی پیش نظر تھا، لیکن وہ اسے دیکھ ہی نہ سکے۔ میرے نزدیک پتے کے رنگ میں ڈوب جانے والا بھی اندھا ہی ہے، جو اس کے رنگ میں ہی محو ہو گیا، لیکن اس پتے میں رنگ بھرنے والے کو نہ دیکھ سکا، حالانکہ وہ بھی وہیں کہیں چھپا ہوا تھا۔ اگر تیری آنکھ کمزور ہے اور تو اس کو نہیں دیکھ سکتا، تو کسی ماہر کاریگر سے اس کو دیکھنے والی عینک لے آ۔ وہ تمہیں تیری صلاحیت کے مطابق دور و نزدیک سے دیکھنے والی عینک دے سکتا ہے۔ اور وہی تیری نظر کی کمزوری کا علاج ہے۔

میں شرقپور شریف کی گلیوں بازاروں کو دیکھتا ہوں۔ ان پتھریلی اور سخت اینٹوں، دیواروں، سڑکوں اور چوکوں کی نکروں میں شاید کسی کو ان کی سختی اور پتھریلے پن سے زیادہ نظر نہ آتا ہو۔ مہیکن مجھے تو ان کی سختی اور پتھریلے پن کیساتھ ہر جگہ وہ بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے ان کو ”شریف“ بنایا۔ اگر گلیاں اور عمارتیں ہی دیکھتا ہوں تو لاہور یا



کسی روشنیوں کے شہر کو دیکھ لینے سے آنکھیں بھر جاتیں۔ پھر شرقپور شریف کی نشتہ سڑکوں کو چومنے کون جاتا۔ وہی جاتا ہے جس کو ان کے علاوہ بھی بہت کچھ نظر آتا ہے۔ ظاہری آنکھ صرف جسم کو دیکھتی ہے۔ اور روح کی آنکھ جسم اور روح دونوں کو دیکھتی ہے۔ جسمانی آنکھ سے دیکھنے والا جسم کو مردہ حالت میں دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ مر گیا ہے۔ اب یہ خاک میں دفن ہو کر خاک ہی میں مل جائیگا۔ اسے کیا خبر کہ کونسا جسم کیڑے مکوڑوں کی خوراک کیلئے بنایا گیا ہے اور کونسا جسم قبل و بعد از مردن بھی جسموں اور روحوں کی زندگیوں کو جلا دینے کیلئے بنائے گئے ہیں؟

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ”اخبار الاخیار“ میں حضرت شیخ احمد بدایونی (۷۰۱-۷۶۹) کے حالات زندگی لکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ احمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ میرے دوستوں میں سے تھے بڑے صالح اور درویشوں سے محبت کرنے والے ابدال صفت بزرگ تھے۔ اگرچہ باضابطہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر دن رات کا شغل شرعی مسائل میں انہماک تھا آپ کے وصال فرمانے کے بعد ایک دفعہ آپ کو خواب میں دیکھا۔ ملاقات ہوئی تو انہوں نے روایتی ظاہری حیات کے معمول کے مطابق مجھ سے شرعی مسائل ہی دریافت فرمائے میں نے ان سے عرض کیا جو کچھ آپ دریافت فرما رہے ہیں ان کا تعلق دنیا کی زندگی سے ہے۔ اور بحالت موجودہ تو آپ مردہ ہیں اس لیے آپکو ان مسائل کی کیا ضرورت ہے؟ تو انہوں نے میرا جواب سن کر فرمایا۔ نظام الدین اللہ تم پر رحم فرمائے تم بھی اولیاء اللہ کو مردہ ہی سمجھتے ہو؟



میرے نزدیک اولیاء اللہ مردہ ہی ہوتے ہیں لیکن ایسے مردہ نہیں جنہیں منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا جاتا ہے، بلکہ ایسے مردہ جو موت تو اقبل ان تموتوا کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ نبی رحمت ﷺ فرمایا کرتے تھے جس نے مردہ کو دیکھا ہو وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے (کیونکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر یقین آجائے گا کہ مرنے کے بعد زندہ کیسے ہوتے ہیں)۔

ایسے زندہ لوگ روحانی آنکھ والوں کو ہر حال میں نظر آتے رہتے ہیں۔ تو بھی نظر کو تیز کرنے والا سرمہ تلاش کر۔ اللہ مدد فرمانے والا ہے۔ شرقپور شریف کی پانچ کلی ٹوپی ہو، یا پاکیزہ مقدس داڑھی، رات کے طویل سجدے ہوں یا بھیگی پلکیں، 'عجزوا انکساری کا غازہ ہو یا محبت و الفت کا پیکر جمیل، 'ملکانہ دروازہ ہو یا دھندل پورہ، 'تاغلوں کا اڈہ ہو یا بس سٹاپ، 'گرمناوالہ ہو یا یا گھنگ شریف۔ پھر پھلتے پھلتے دور تک چلے جاؤ۔ آنکھوں میں سمایا ہوا پیکر جمیل، نظروں میں بسا ہوا حسن زیبائی حضرت میاں شیر محمد رحمۃ اللہ علیہ ہی نظر آئے گا۔

کتاب ہذا "ضیاء الفقراء" کا حرف حرف اسی پیکر جمیل کا حسین عکس ہے۔ میرے محسن و مربی حضرت علامہ محمد انور قمر شرقپوری دامت برکاتہم العالیہ کے نوک قلم کے تراشے ہوئے ہر لفظ میں حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کی تصویر نظر آتی ہے۔ مولانا محمد یونس سین قصوری نقشبندی نے ان تصویروں کو اکٹھا کیا اور آپ کیلئے ایک خوبصورت طاقچہ سجالائے ہیں۔ یہ طاقچہ محبت و عشق سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو بھیگا پن بھی بخشنے گا اور رت جگے کے تحفے



بھی دے گا۔ کسی کی یاد میں صدیوں تک گم رہنے کی بھیک بھی عطا کرے گا۔ ان شاء  
اللہ۔

عبدالحق ظفر چشتی

۲۳-۹-۹۷ کرم پبلی کیشنز سرور مارکیٹ

سرکلر روڈ۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

## ”حرف تعارف“

ایک عام سے قصبے شرپور نے جو شرق پور شریف کا نام پایا تو یہ اس کا اپنا کوئی کمال نہیں ہے، اسے شریف ہونے کا اعزاز اس ہستی کے وجود مسعود کے باعث ملا جس کے انگ انگ میں بس شرافت ہی شرافت تھی۔ اس ہستی کا نام اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد شرپوری رحمۃ اللہ علیہ ہے، جن کی ولادت سے پہلے ہی یہاں کی فضاؤں میں حضرت بابا میاں امیرالدین رحمۃ اللہ علیہ آ کے خوشبو سونگھا کرتے تھے اور جب وہ آگئے تو ہر جانب خوشبوئیں پھیل گئیں۔

اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد میاں عزیز الدین رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں سعادتیں ہی سعادتیں رقص کناں ہونے لگیں، نور افشانی ہونے لگی۔۔۔۔۔ یہ وہ بچہ تھا جس نے شرپور شریف کے ایک ایک ذرے کی قسمت بدل دی۔ آپ کی پیدائش کی خبر حضرت بابا مولوی غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کو ہوئی۔ تو آپ نے اس بچہ کو اپنے ہاں منگوا بھیجا اور اپنی زبان انکے منہ میں ڈال دی اور زبان کو چوسایا۔ حضرت مولوی غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اعلیٰ حضرت میاں صاحب شرپوری رحمۃ اللہ علیہ کے آباء میں سے تھے اور مرد کامل تھے تو تاں والی مسجد (موجود، مسجد میاں صاحب) میں بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ کے طفولیت کا زمانہ بڑا بے نظیر اور حیران کن تھا۔ اس کی مثال سوائے اولیائے متقدمین کے کسی اور طبقے کے بچوں میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے ان کے مادر زاد ولی



ہونے کا یقین دلاتی ہے۔ جوں جوں آپ بڑے ہوتے گئے آپ کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار اور اجاگر ہوتی گئیں۔ بچپن کی شرارتیں اور کھیل کود جیسی عادتیں جو بچپن کا خاصہ ہیں نام کو نہ تھیں۔ کم گوئی، کم خوری، ادب، فرمانبرداری اور غور و فکر شروع میں ہی آپ کی عادات میں شامل تھا۔

تھوڑے ہی عرصے میں آپ نے قرآن کریم پڑھ لیا۔ پھر سکول میں داخل ہوئے۔ مگر پرائمری جماعتوں تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد سکول کو چھوڑ دیا۔ سکول کے ماحول میں آپ کی طبیعت لگتی ہی نہ تھی۔ حافظ حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے چند درسی کتابیں پڑھیں اور لکھنے میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی۔ خوش نویسی آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ اسم ذات (اللہ) بڑے حروف میں بہت ذوق و شوق سے لکھا کرتے۔ قرآن مجید کے بوسیدہ اور پھٹے ہوئے اوراق لکھ کر ان کے ساتھ چسپاں کر دیتے تھے تاکہ قرآن پاک کا متن مکمل رہے۔

آپ نے کوٹلہ بنجو بیگ ضلع شیخوپورہ میں حضرت خواجہ امیر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی اور سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے۔ مرشد نے ہی آپ کو میاں صاحب کا خطاب دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ اے امیر الدین دنیا سے کیا لائے ہو تو میں عرض کروں گا ”میں تو صرف حضرت میاں شیر محمد صاحب کو ہی لاسکا ہوں۔“ جب مرشد نے دیکھا کہ یہ شہباز لاہوتی سلوک کی ساری منزلیں (ساتوں منزلیں) طے کئے جا رہا ہے تو بڑے خوش ہوئے۔ پھر لوگوں کی اصلاح اور مدائت کے لئے مارِ خلافت آپ کو تفویض کر دیا۔



اور عوام الناس کو ارشاد و تلقین کا حکم فرمایا۔

سرکار میاں صاحب شر قپوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ:

بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے کیا دیا ہے؟ دہکتے ہوئے کوٹلوں اور انگاروں کا ٹوکرا (بار خلافت) میرے سر پر رکھ دیا ہے۔ اور میں نے پاس ادب کی وجہ سے بلا چون چراں اٹھالیا ہے۔

اعلیٰ حضرت میاں صاحب شر قپوری رحمۃ اللہ علیہ ایک سچے عاشق رسول تھے۔ انہوں نے زندگی بھر کوئی کام سنت کے خلاف نہیں کیا۔ اور جن لوگوں کے معمولات سنت کے خلاف دیکھے ان کی اصلاح اس انداز سے کی کہ وہ قبیح سنت بن گئے۔ آپ کا کشف اور تصرف ایک حقیقت تھا۔ آپ نے جس کے لئے ہاتھ اٹھادیئے اس کا کام بن گیا۔ اور اس کی قسمت سنور گئی۔

○ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اپنے اوپر لگے ہوئے فتوے کے باعث بڑے پریشان تھے۔ وہ آئے تو ان کی تقدیر بدل گئی۔

○ بابو حاجی محمد دین کی بیماری کے باعث ڈاکٹروں نے ۶ ماہ تک موت کو یقینی قرار دے دیا۔ وہ آئے تو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹروں سے مشورہ کر لیا ہے۔ مزید یہ فرمایا کہ وہ (بابو محمد دین) لمبی عمر پائیں گے۔

○ قادا ڈاکو آیا تو میاں قادر بخش حکیم بن گیا۔

○ ڈاکٹر محمد یوسف آپ کی چوکھٹ سے ہی عالمی شہرت کا حامل بن گیا۔

○ محمد ابراہیم رئیس قلعہ گوجر سنگھ اسی آستانہ سے ہرنیاں (فتق) کی بیماری سے



صحت یاب ہو گیا۔

○ بابو خدا بخش اسی بارگاہ کے باعث متوکل بن گیا۔

○ اور نو مسلم غلام حسین نیڈو کے ایمان میں پختگی حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے ہوئی۔

اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ۳ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ بمطابق ۲۰ اگست ۱۹۲۸ء دو شنبہ کے دن شرقپور شریف میں ہوا۔

حضرت شیر محمد آفتاب علم و دین

جلوہ آئینہ انوار رب العالمین

معدن جود و سخا چشمہ صدق و صفا

ناقصوں پر ہو کرم بہر محمد مصطفیٰ

حضرت قبلہ میاں ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ابتدائی عمر میں دنیوی امور کی طرف زیادہ تھا۔ اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد شرقپوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ چونکہ میاں غلام اللہ صاحب طریقت کی طرف زیادہ مائل نہیں ہیں تو آپ کے سلسلے کو کون چلائے گا؟ آپ نے فرمایا۔ یہ بتاؤ جب کوئی تھانیدار بدل جاتا ہے تو اس کی جگہ کسے ملتی ہے؟ سوال کرنے والے نے کہا صاف بت ہے کوئی تھانیدار ہی اس کی جگہ لے گا۔ مزید پوچھا اور اگر کوئی تحصیل دار بدل جائے تو؟ جواب ملا اس کی جگہ پر تحصیل دار آئے گا۔

اس پر میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تردید کی کوئی بات نہیں میری جگہ پر بھی وہی بیٹھے گا جو اس کا اہل ہو گا۔

اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شر قپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حقیقی چھوٹے بھائی کی طرف توجہ کی تو انہیں ثانی لاثانی بنا دیا۔ انہیں سلوک کی منزلیں طے کار کے مرد کامل بنا دیا۔ اور جب حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کلوصل ہوا تو حضرت میاں غلام اللہ صاحب ثانی لاثانی کے لقب سے سجادہ نشین بنے۔

حضرت میاں غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں آپ نے دینی اور دنیوی تعلیم حاصل کی اور طب کی تعلیم حکیم محمد اسماعیل سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ میونسپل کمیٹی شر قپور شریف میں ملازمت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ زمینداری بھی کرتے رہے۔ آپ نے جو کام بھی کیا نہایت نفاست دیانت اور صداقت سے کیا۔

آپ نے اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شر قپوری رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب آپ کو عبادت و ریاضت میں پختہ پایا تو لوگوں کی اصلاح کی خاطر خلافت سے سرفراز فرمایا۔ آپ نے غیر شرعی کاموں سے ہمیشہ اجتناب فرمایا۔ آپ نے بھی اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مساجد کی تعمیر کی۔ جامعہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بنیاد رکھی۔ تحریک پاکستان میں بھی آپ نے شرکت کی۔

آپ صاحب کرامت، اور صاحب تصرف بزرگ تھے۔ حافظ محمد شفیع اوکاڑوی جو



خطیب پاکستان بنے تو وہ آپ کی ہی نظر کرم سے بنے۔ بابا جلال الدین کو حکیم بنا دینے میں آپ کی خاص توجہ ہوئی اور ٹاہلی والی مسجد شرقپور شریف کی تعمیر حاجی محمد حسین کال کے حوصلوں میں مضبوطی پیدا کی۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ۷ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ میں وصال فرمایا۔ اور اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے بائیں پہلو میں مزار شریف کے اندر مدفون ہوئے۔



اللہ ہو

☆ مرد کامل نے اللہ ہو کے ورد سے اختلاج قلب کا علاج کر دیا۔

☆ مسور کی وال (جو ورد گردہ کے لیے سرپا نقصان دہ ہے) سے ورد گردہ کا علاج فرما

دیا۔

☆ ولی اللہ نے پانی پر پھونک مار کر اسے پرانے بخار کے لیے آب شفا بنا دیا۔

☆ ایک غریب گھرانے کے فرد کو اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ

علیہ نے حق اور باطل میں امتیاز کرنے والی معروف شخصیت بنا دیا۔

پاکستان بنا تو مہاجرین جو پاکستان میں آئے، ان کے اٹاٹے ہندوستان میں رہ گئے۔

ایسے ہی جو ہندو ادھر سے گئے، ان کے اٹاٹے ادھر تھے۔ یہ جائزہ لینے کے لیے کہ کس

قدر املاک پاکستان میں آنے والے مہاجرین کے بھارت میں ہیں؟ حکومت پاکستان نے

ماہرین حساب کتاب کا ایک وفد بھارت میں بھیجا۔ اس وفد کی قیادت پنجاب پولیس کے

سینئر آڈیٹر جناب بابو حاجی محمد دین شرقپور شریف والے کے حصے میں آئی۔ یہ اعزاز

واقعاً ان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ آج ہم اسی بابو محمد دین کی زندگی سے متعلق چند

ایک باتیں منظر عام پر لانا چاہتے ہیں۔

86575

69075



بیسویں صدی کے شروع تک بھی تعلیم اتنی عام نہ تھی۔ لوگ محض قرآن پاک کی تعلیم (ناظرہ قرآن پڑھنا) کو کافی سمجھتے تھے اور یہ تعلیم مساجد میں عام ہوتی تھی۔ مساجد میں پڑھنے والے بچوں کو لوگ بڑی بے تکلفی سے ”مولوی“ کہتے تھے۔ جبکہ سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو لوگ ”بابو“ کہتے تھے۔ شیخ محمد دین نے قرآن پاک کی تعلیم حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں قاری محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ سر پر رومل باندھے، ہاتھ میں ایک چھڑی لیے گھر میں آتے تو سب کو بڑے پیارے لگتے۔ مں دیکھتی تو خوش ہو جاتی۔ ابو (شیخ اللہ بخش کھروٹہ) اپنے اس ہونہار بیٹے کو دیکھتے تو اٹھا کر سینے سے لگا لیتے۔ منہ چومتے جاتے اور کہتے جاتے میرا مولوی بیٹا آگیا۔ میرا مولوی بیٹا آگیا۔

محمد دین مں باپ کے علاوہ بھی ہر ایک کو پیارا لگتا تھا۔ ایک دن مسجد میں پڑھنے والے بچوں کے ساتھ جھوم جھوم کر قرآن پاک پڑھ رہا تھا کہ اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شر قپوری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ محمد دین کو اس لگن کے ساتھ پڑھتے دیکھا تو بڑے خوش ہوئے، آپ اس کے پاس گئے، اٹھایا اس کا منہ چوما، خوش ہوئے اور سینے سے لگالیا۔ پوچھا۔ ”بیٹا آپ کا کیا نام ہے؟“

بچے نے عرض کیا۔ ”حضور میرا نام محمد دین ہے۔“

”ماشاء اللہ بڑا پیارا نام ہے۔ کیا آپ کا تعلق شیخ برادری سے ہے؟

”جی حضور! میں شیخ اللہ بخش کھروہ کا بیٹا ہوں۔ وہ میرے ابو بیٹھے ہوئے ہیں۔“

بچے نے اپنے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو مسجد میں ایک کونے میں بیٹھے اوراد میں مشغول تھے۔ اور میاں صاحب کے معتدین میں سے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر حضرت صاحب کے قریب آگئے اور خادمانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

حضرت صاحب نے محمد دین سے فرمایا۔ ”بیٹا سکول بھی جلیا کرو۔ سکول کی تعلیم حاصل کر کے بابو بن جاؤ۔“

عرض کیا۔ ”مجھے تو لوگ مولوی کہتے ہیں۔ کیا مولوی لوگ اچھے نہیں ہوتے کہ میں بابو بن جاؤں۔“

”نہیں نہیں۔ مولوی لوگ تو بہت اچھے ہوتے ہیں، مگر دنیا کے سارے کام مولوی تو نہیں کر سکتے۔ کچھ کام بابوؤں کے کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ آپ کریں گے

حضرت صاحب نے محمد دین کے والد ماجد سے فرمایا ”قرآن پاک کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد اسے سکول کی تعلیم بھی ضرور دلوانا۔“

چنانچہ حضرت صاحب کی تحریک اور ہدایت کے مطابق محمد دین کو سکول میں بٹھا



دیا گیا۔ چونکہ ذہانت اور فطانت اس لڑکے کو کلنی ملی تھی، پوری جماعت کے اچھے لڑکوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ ہندو لڑکوں کے ساتھ آپ کا مقابلہ تھا۔ اگر کسی سال کوئی ہندو لڑکا اس سے زیادہ نمبر لے لیتا تو دوسرے سال اس لگن کے ساتھ محنت کرتا کہ اسے کتنے ہی نمبر پیچھے چھوڑ جاتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ محمد دین کو بخار سارہنے لگا۔ جونہی کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھتا باپ کتابیں چھین لیتا اور کہتا کہ صحت سے بڑھ کر کوئی چیز اچھی نہیں۔ بخار اتر جائے گا تو پڑھائی کر لینا۔ چونکہ اس سال چھٹی جماعت کے امتحان میں ایک ہندو لڑکا شوری لال محمد دین سے 9 نمبر زیادہ لے کر اول آگیا تھا، اس لیے محمد دین چاہتا تھا کہ وہ ساتویں جماعت کے امتحان میں شوری لال کو ضرور بچھاڑے گا۔ مگر محمد دین کی بیماری طول کھینچ گئی۔ کتابوں سے بالکل لا تعلق ہو گیا۔

ایک دن محمد دین نے اپنے والد سے کہا کہ میرا ایک دوست عبداللطیف ہے، جو محمد بوٹا کہار کا بیٹا ہے۔ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ اگر آپ اس کو بلوا دیں تو کرم ہو گا۔ مگر میاں اللہ بخش اس دن عبداللطیف کو نہ بلوا سکا۔ وہ اپنی دوکان (بان فروشی) میں مگن رہا۔ شام کو جب باپ گھر میں آیا تو محمد دین نے کہا۔ ”جب تک عبداللطیف نہیں آئے گا میری آنکھیں آنسو بہاتی رہیں گی۔“

عبداللطیف لاہور میں رہتا تھا۔ محمد دین بھی لاہور میں پڑھتا تھا مگر شرپور شریف

میں والدین کی رہائش کی وجہ سے ہفتے دو ہفتے کے بعد گھر میں آتا تھا۔ اب چونکہ اسے بخار تھا اس لیے کوئی ایک ماہ سے وہ سکول نہیں گیا تھا۔ اگلے دن صبح سویرے غلام محمد (محمد دین کا چھوٹا بھائی) اپنے بھائی سے عبداللطیف کا پتہ لے کر لاہور میں گیا۔ اس سے ملا اور محمد دین کا پیغام دے کر اسے ساتھ لے جانے کو کہا۔ چنانچہ اس شام دوستوں نے ایک دوسرے سے ملاقات کر لی۔ چہرے مسکرائے۔ دل بلیوں اچھلنے لگے۔

علیک سلیک کے بعد عبداللطیف نے بلائے جانے کی وجہ پوچھی۔

محمد دین نے کہا۔ ”دیکھتے نہیں ہو بخار نے پکی دوستی میرے ساتھ کر لی ہے، ہر وقت میرے سر پر چڑھا رہتا ہے۔ میری کتابیں اس نے مجھ سے چھین لی ہیں۔ پڑھائی کا سلسلہ بالکل منقطع ہے۔ آپ جانتے ہیں نا پچھلے سال شوری لال کے نمبر مجھ سے زیادہ تھے، اب کے پھر یقیناً اس کے نمبر مجھ سے بڑھ جائیں گے۔ میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ ہندو کی جیت نہیں ہونی چاہیے تم محنت کرو اور اس شوری لال کو بچھاؤ دو“

”دوست! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میرا شوری لال سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو بالکل نیچی سطح کے لڑکوں سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”کیا شوری لال کے دماغ دو ہیں۔ کیا اس کی چار آنکھیں ہیں۔ جو کچھ اللہ نے



اسے دیا ہے وہی کچھ آپ کو دیا ہے بلکہ آپ تو مسلمان ہیں۔ اللہ کو ماننے والے ہیں۔  
 ہندو رام رام کرنے والا ہے۔ بتوں کے آگے جھکتا ہے۔ اگر میں تندرست رہتا تو اسے  
 ضرور پیچھے چھوڑ دیتا۔ اب مجھے صرف آپ سے امید ہے۔ میری آنکھیں آپ کو اس  
 سے آگے دیکھنا چاہتی ہیں۔ محنت کرو۔ خوب محنت کرو اور دن رات پڑھتے رہو اور  
 شوری لال سے بہت آگے نکل جاؤ۔“

عبداللطیف نے وعدہ کر لیا وہ ضرور کوشش کرے گا۔

شام کو اللہ بخش میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پانی دم کروا کر لایا۔ محمد دین کا  
 بخار شاید اس پانی کا منظر تھا‘ پانی پیا تو بخار نے پیچھا چھوڑ دیا۔ بخار اترا تو چہرے پر  
 ہلاکت آنے لگی۔ آہستہ آہستہ کمزوری بھی رخصت ہو گئی۔

امتحان میں صرف تین ماہ باقی تھے۔ محمد دین کا بڑا وقت ضائع ہو چکا تھا، مگر اس نے  
 ہمت کا دامن پھر تھام لیا۔ کتابیں اٹھائیں اور پڑھائی شروع کر دی۔ سفر لمبا تھا اور وقت  
 تھوڑا، دن رات ایک کر دیا۔

آخر امتحان ہوا۔ نتیجہ نکلا تو جو بچہ جماعت بھر میں اول رہا تھا وہ محمد دین شیخ تھا۔  
 دوسرے نمبر پر عبداللطیف تھا۔ جبکہ شوری لال کا نمبر چوتھا۔ عبداللطیف اور محمد دین باہم  
 بغلیں ہو گئے۔

محمد دین کی پڑھائی ایسے ہی جاری رہی۔ ہر سال اول یا دوم نمبر پر اس کا نام ہوتا۔

1918ء میں دسویں جماعت کا امتحان ہوا تو سکول بھر میں اول آنے والا طالب علم بھی

محمد دین شیخ ہی تھا۔

اب محمد دین نے پڑھائی چھوڑ دی۔ نوکری کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔

اے جی آفس میں کلرکوں کی چند آسامیاں تھیں۔ اس نوجوان نے درخواست دے دی

کوئی ایک مہینے کے بعد آزمائشی ٹیسٹ کیلئے بلایا گیا تو اچھے نمبروں میں پاس ہونے والوں

میں محمد دین کا نام بھی تھا۔ پھر ایسے کامیاب امیدواروں کا انٹرویو ہوا تو بھی محمد دین کامیابی

سے ہمکنار ہوا۔ ذہانت کا ٹیسٹ ہوا تو اس میں بھی کامیاب رہا۔ اب آخری مرحلہ

میڈیکل ٹیسٹ کا تھا۔ آنکھیں، کان، گلا، اور ناک کو دیکھا گیا۔ چھاتی اور دل کا معائنہ کیا

گیا۔ تو دل کی دھڑکن میں فٹور محسوس کیا گیا۔ پھر آلات کے ذریعے دل کے سکڑنے

اور پھیلنے کا ریکارڈ تیار کیا گیا تو خطرناک قسم کی صورت دکھائی دی۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔ ”ایسے لگتا ہے کہ آپ کے دل کی شریانوں میں خون جما ہوا ہے۔

دل جس قدر خون صاف کرتا ہے وہ شریانوں کے تنگ رستے کی وجہ سے سارے کا سارا

جسم کے دوسرے حصوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ کے سینے میں اکثر

درد رہتا ہے تو یقیناً ”آپ میری بات کو جھٹلائیں گے نہیں۔“



نوجوان نے کہہ ”سینے میں درد والی بات درست ہے۔“

”تو بیٹا آپ کا مرض جس طرف گامزن ہے اس سے موت کے امکانات زیادہ ہیں۔ میرا خیال ہے اگر یہی صورت حل رہی تو آپ کی زندگی صرف 6 ماہ تک باقی دکھائی دیتی ہے۔ آپ کو علاج اور مکمل ریسٹ کی ضرورت ہے۔ لہذا آپ اس نوکری کے لیے فٹ (Fit) نہیں ہیں۔“

محمد دین نے اپنے آپ کو ان فٹ (Un-Fit) پایا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھلنے لگا۔ چہرے کی رنگت بالکل پیلی ہو گئی، ماتھے پر پسینہ آگیا۔ عین ممکن تھا کہ محمد دین گر جاتا کہ ایک دوسرے ڈاکٹر نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ایک میز پر لٹا دیا۔ سر نیچا کیا اور ٹانگوں کو اونچا اٹھایا۔ منہ پر پانی کے چھٹے دیئے۔ تھوڑی دیر بعد نوجوان کی حالت سنبھل گئی۔

جب محمد دین کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو عرض کیا۔ ”میں جا کر اپنا علاج کرواؤں گا مگر مجھے یہ ضرور سہولت دی جائے کہ 6 ماہ کے بعد دوبارہ صرف میڈیکل ٹیسٹ لیا جائے اور میرے دوسرے ٹیسٹ بحال رکھے جائیں۔ اگر میں طبی طور پر درست پایا جاؤں تو مجھے نوکری دے دی جائے بصورت دیگر مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔“

محمد دین جو نوکری مل جانے کی آس لے کر گیا تھا، اب نوکری نہ ملنے کا روگ

لے کر حملین صورت بنا کر واپس آگیا۔ عصر کے وقت اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شر قپوری رحمۃ اللہ علیہ کے حضور حاضر ہوا اور ڈاکٹر کی ساری بات آپ سے عرض کر دی۔

”اچھا ڈاکٹر کہتا ہے آپ چھ مہینے کے بعد مرجائیں گے۔ کیا ڈاکٹر سے خدا نے مشورہ کیا ہے یا آپ کی موت کا اختیار اللہ تعالیٰ نے اس ڈاکٹر کو دے دیا۔ کیا ڈاکٹر یہ بات بھول گیا ہے کہ انسان خدا کا بندہ ہے۔ وہ جب تک چاہے اسے زندہ رکھے۔ جب چاہے مارے۔ کسی کو کیا دخل ہے؟“

”آپ میری بات غور سے سن لیں۔ آپ چھ مہینے کیا 6 سال تک نہیں مریں گے بلکہ 60 سال تک نہیں مریں گے اور شاید آج کے بعد سڑ سھواں سال آپ کی موت کا سال ہو۔ جاؤ اللہ کا ذکر کرتے رہو۔ سانس اندر لے جاؤ تو ”اللہ“ کہو اور سانس باہر نکالو تو ”ہو“ کہو۔ اللہ ہو کا ورد دلوں کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔“

محمد دین نے چونکہ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کو یہ اپیل کر رکھی تھی کہ اسے 6 ماہ کے لیے نوکری دی جائے۔ اگر 6 ماہ بعد اس نے اپنا علاج نہ کروایا یا وہ صحت یاب نہ ہوا تو اسے نوکری سے بے شک نکال دیا جائے۔

یہ اپیل منظور ہو گئی اور محمد دین کو اے جی آفس لاہور میں جو نیر کلرک رکھ لیا گیا



اور شیخ محمد دین اب بابو محمد دین بن گیا۔ وہ ایک طرف دفتر کا کام نہایت لگن کے ساتھ کرتا اور دوسری طرف حضرت صاحب کا بتایا ہوا وظیفہ ”اللہ ہو“ باقاعدگی سے پڑھتا رہا۔ اس طرح 6 مہینے گزر گئے۔ دفتر میں چھ میگوئیاں ہونے لگیں کہ بابو محمد دین کی جگہ اب خالی ہونے والی ہے۔ ہر شخص اپنے کسی عزیز کو اس جگہ پر ملازم رکھوانے کی فکر کرنے لگا کہ ایک دن بابو محمد دین کو ایک چٹھی دی گئی کہ وہ اپنا طبی معائنہ کروا کر فٹ نس (Fitness) کا میڈیکل سرٹیفکیٹ مہیا کرے۔

بابو محمد دین پر ایک بار پھر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ دفتر میں وہ باقی وقت تک بے دلی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ دوسرے دن اسے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ (M.S) کے ہاں پیش ہونا تھا۔ وہ شام کو ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس گیا اور اپنے دل کا معائنہ کروایا۔ ڈاکٹر نے کہا دل کی دھڑکن ٹھیک ہے۔ بس معمولی قسم کی گھبراہٹ سی ہے۔ پھر وہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ عرض کیا۔ کل پھر اس کا طبی معائنہ ہو رہا ہے۔ گھبراہٹ سی ہے نہ جانے نتیجہ کیا نکلے۔

میاں صاحب نے فرمایا۔ ”اللہ خیر کرے گا۔ گھبراہٹیں بالکل نہیں۔ بس اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ کرتے رہیں۔“

دوسرے دن جب بابو محمد دین کا میڈیکل ٹیسٹ کیا گیا اور اس کے دل کی دھڑکن

کا ریکارڈ محفوظ کیا گیا تو ڈاکٹر کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ دل کی دھڑکن میں بالکل باقاعدگی تھی اور یہ دھڑکن ایک صحت مند انسان کی غماز تھی۔

ڈاکٹر پوچھنے لگا۔ ”نوجوان! تم بڑے خوش قسمت ہو۔ آپ کے دل میں کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں ہے۔“ اس انگریز ڈاکٹر نے مزید پوچھا کہ نوجوان محمد دین تم نے کس ماہر امراض قلب سے علاج کروایا ہے؟

بابو نوجوان نے عرض کیا۔ ”میرا علاج کسی بھی میڈیکل ڈاکٹر نے نہیں کیا بلکہ ایک روحانی ڈاکٹر نے کیا ہے۔“

”روحانی ڈاکٹر سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”ایسا مرد کامل جو بس نظر کے فیض سے علاج کر دے یعنی یہ سارا کرشمہ میرے مرشد کامل کا ہے۔ انہوں نے صرف ”اللہ ہو“ کا وظیفہ پڑھنے کو فرمایا اور اللہ نے کرم فرما دیا۔ مجھے صحت ہو گئی۔“

”اچھا آپ کی مراد کسی پیرپادری کی کرامت ہے۔“

ڈاکٹر نے فٹ نس (Fitness) کا میڈیکل سرٹیفیکٹ دے دیا۔

یوں بابو محمد دین کی نوکری جو صرف 6 ماہ کے بعد ختم ہو رہی تھی، بحال رہی۔

اب بابو محمد دین نے محکمہ امتحانات پاس کرنا شروع کر دیئے۔ ہر امتحان اول



پوزیشن میں پاس کیا اور ترقی کے ذہنوں تک اس کی رسائی ہوتی گئی۔ آخر وقت آیا کہ وہ سینئر آڈیٹر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

اسی دوران میں میونسپل کارپوریشن ملتان میں لاکھوں روپے کے فراڈ کا سکینڈل بنا۔ اسکی چھان بین کا کام بابو محمد دین کے سپرد ہوا۔ آپ ایک مختصر ٹیم کے ساتھ ملتان گئے۔ سارے ریکارڈ اپنی تحویل میں لے کر کام شروع کر دیا اور چند ہفتوں میں پائی پائی کا حساب بنا کر ہائی کمان کے سپرد کر دیا۔ اس کام میں آپ کو بطور انعام دس ہزار روپے ملے۔

اب آپ کی خدمات پنجاب پولیس میں منتقل کر دی گئیں اور آپ سینئر آڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس محکمے میں قدم قدم پر آپ کو کوتاہیاں ہی کوتاہیاں نظر آئیں۔ پھر کیا تھا آپ کی خدمت میں تحفے، ہدیے اور نقد نذرانے لے کر لوگ آنے لگے۔ مگر آپ نے ہر ایک پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پورے پنجاب کی پولیس کے ریکارڈ میں کسی قسم کی بھی گڑبڑ کرنے میں ہر بابو ڈرنے لگا۔

ایک دن اچانک بابو محمد دین کو درد گردہ کی تکلیف ہو گئی اور یہ تکلیف شدت اختیار کرتی گئی۔ نسبت چوک میں کوئی حکیم صاحب تھے، ان کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے دوائی دی اور پرہیز میں مسور کی دال سختی سے منع کرتے ہوئے کہا کہ یہ دال

اس مرض کے لیے زہر قاتل ہے۔ آرام بھی آجائے تو بھی زندگی بھر اسکا استعمال نہیں کرنا ہے۔

دوائی کھانے سے حالت سنبھل گئی۔ پھر سارا دن دفتر میں کام کرتے رہے۔ شام کو واپس گھر میں آئے تو ہلکا ہلکا درد پھر ہونے لگا۔ آپ سیدھے حضرت صاحب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس دن لنگر میں مسور کی دال پکی ہوئی تھی۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ”بابو جی کو لنگر کھلایا جائے۔“ چونکہ لنگر میں مسور کی دال تھی جو حکیم کی ہدایت کے مطابق آپ کے لیے نقصان دہ تھی، لہذا آپ نے کہا۔ ”مجھے کھانے کی حاجت نہیں ہے۔ میں کھانا کھا کر ہی آیا ہوں۔“

حضرت صاحب نے فرمایا ”اچھا اگر کھانا نہیں کھانا تو یہ دال کا پیالہ پکڑو اور پی جاؤ

بابو محمد دین جس بات سے ڈر رہے تھے اس پر آپ کو عمل کرنا پڑا۔ عقل نے کہا۔ دال پی لی تو مرجاؤ گے۔ وہ بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو پیچھے کھینچ دیتی مگر عقیدت کہہ رہی تھی کہ دال کا پیالہ پکڑ لے اور ایک ہی سانس میں سارا پیالہ پی جاؤ۔ ڈاکٹر نے ایک بار کہا تھا کہ تم صرف 6 ماہ کے بعد مرجاؤ گے مگر میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر کی بات کو غلط کر دیا تھا۔ اب حکیم نے کہا ہے کہ مسور کی دال کھاؤ گے تو مرجاؤ گے مگر



میاں صاحب فرما رہے ہیں کہ دال کا پورا پیالہ ہی پی جاؤ۔ سیکولر عقل نے دم توڑ دیا۔  
 عقیدت جیت گئی۔ بابو محمد دین نے پیالہ پکڑا اور غٹا غٹ پی گئے۔ اب اجازت ملنے پر گھر  
 جارہے تھے کہ راستے میں درد میں شدت آنے لگی۔ ہر قدم پر اس میں اضافہ ہی ہوتا  
 گیا۔

ہائے ہائے کرتے اور جھکتے ہوئے جارہے تھے۔ گھر کی دہلیز کو پار کیا کہ نڈھال ہو کر  
 گر پڑے۔ گرے تو پیشاب نکل گیا۔ اس قدر پیشاب آیا کہ مکان کی ڈیوڑھی جل تھل  
 ہو گئی۔ کپڑے پیشاب سے بھیگ گئے۔ بے ہوشی طاری ہو گئی۔ بھائیوں (غلام محمد اور نور  
 محمد) نے اٹھا کر چارپائی پر لٹایا۔ گیلے کپڑے اتارے اور ٹانگوں کو دھویا اور دھلے ہوئے  
 کپڑے پہنائے۔ مگر گیلے تہبند میں پتھر کے چھوٹے چھوٹے کئی ذرے تھے۔ یہ پتھری  
 کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے تھے جو درد گردہ کا باعث بنی ہوئے تھے اور محض دال پینے سے  
 اس کا اخراج ہو گیا تھا۔ پھر زندگی بھر بابو محمد دین کو درد گردہ کی تکلیف نہیں ہوئی۔

1953ء میں بابو محمد دین ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو ان کی خدمات کا اعتراف

نہایت ہی اچھے الفاظ میں کیا گیا۔ آپ گھر میں آئے تو دفتر میں ایک زبردست خلا پیدا ہو  
 گیا۔ ان جیسا کوئی دوسرا شخص نہ مل سکا۔ چنانچہ آپ کی خدمات سے مزید فائدہ اٹھانے  
 کے لیے آپ کو مزید پانچ سال کی توسیع دی گئی۔ چنانچہ 1958ء میں آپ کو سبکدوش کیا

گیا مگر اب بھی آپ کا نعم البدل نہ مل سکا۔ چنانچہ آپ کو پھر مزید دو سال کے لیے بلا لیا گیا۔ اس طرح آپ نے 1960ء تک پورے انہماک کے ساتھ کام کیا۔ جوان بابو تھک جاتے مگر یہ بوڑھا بابو حاجی محمد دین کام کرتا چلا جاتا۔

حسن کارکردگی کے اعتراف میں آپ کو کئی تحفے ملے سرٹیفکیٹ بھی ملے۔ آخری عمر میں آپ کو دمہ کی تکلیف ہو گئی۔ (اور 10 جولائی 1985ء بمطابق 21 شوال 1405ھ بروز بدھ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے مرشد کامل اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں مدفون ہوئے)۔

جب ان کی بیماری طول پکڑ گئی تو بیٹے اور بیٹیاں فکر مند ہوئیں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو میری موت تہجد کے وقت ہو گی اور اس وقت موسم بارش کے باعث ٹھنڈا ہو جائے گا۔ بجلی چمکے گی اور رعد شور مچائے گی۔ ان کی تکلیف کے پیش نظر انہیں سروسز ہسپتال میں داخل کروایا گیا۔ 10 جولائی کی شب عین تہجد کے وقت آپ پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ نبضیں ڈوبنے لگیں۔ ڈاکٹر پروفیسر ممتاز حسن صاحب نے فوراً "ایک ٹیکہ لکھ کر دیا۔ حاجی صاحب کا بیٹا محمود احمد اور مسعود احمد فارسٹ کلرک (محمود احمد کا دوست) دونوں ٹیکہ لینے کے لیے نکلے تو آسمان کالے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ موسم



طوفانی بن گیا۔ تیز آندھی چلنے لگی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ رعد کڑک رہی تھی۔ محمود نے اپنے دوست مسعود سے کہا۔ ”اب ٹیکہ لینا فضول ہے۔ اباجی کی بتائی گئی نشانیوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ اباجی کی زندگی کا سفر ختم ہونے والا ہے۔ مجھے واپس جانے دو تاکہ میں اپنے ابو سے کوئی بات کر سکوں۔“

مگر مسعود نے کہا جذباتی نہ بنو۔ حوصلے سے کام لو۔ ٹیکہ ضرور لے جا کر انہیں لگواؤ۔ اللہ تعالیٰ کرم کرنے والا ہے۔ بہر حال ٹیکہ لانے میں بیٹے کی ساری جلدی بے کار گئی۔ وہ جب کمرے میں پہنچا تو بابو جی بالکل خاموش ہو چکے تھے۔ انہوں نے پورے خاندان کو سوگوار چھوڑ کر زندگی کا سفر پورا کر لیا تھا اور زندگی کی آخری منزل سے پرے جا چکے تھے۔

جسد خاکی جب شریقیہ شریف میں لایا گیا تو عقیدت مندوں کا ہجوم ان کے گھر میں موجود تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ لوگ مشورہ دینے لگے کہ انہیں جلدی آغوش قبر کے سپرد کر دیا جائے۔ مگر ان کی بیٹیاں چونکہ کراچی میں تھیں، وہ پانچ بجے شام سے پہلے نہیں آ سکتی تھیں۔ حضرت صاحبزادہ میاں غلام احمد صاحب تشریف لائے۔ ان سے مشورہ کیا گیا انہوں نے فرمایا ”اس عاشق شیر ربانی رحمۃ اللہ اللہ کو آپ خواہ ایک دن کے بعد بھی دفن کریں تو بھی کسی تردد اور فکر کی بات نہیں ہے۔ آپ ان کی بیٹیوں کا ضرور

انتظار کریں۔“

چنانچہ ساڑھے پانچ بجے ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔ جب انہیں دفن کرنے لگے تو جسم میں کوئی اکڑاؤ نہیں تھا۔ بالکل ڈھیلا جسم تھا جیسے زندہ لوگوں کا ہوتا ہے۔

مرتے وقت آپ کی زبان پر ”اللہ ہو“ کا ورد جاری تھا۔ آپ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور تہجد گزار تھے۔ ان کی زبان پر ہمیشہ محبت بھرے الفاظ اور دعائیں رہتی تھیں۔ اعلیٰ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال 1928ء میں ہوا تو آپ تادم آخر آپ کے روضہ اقدس پر برابر حاضری دیتے رہے۔ سالانہ عرس کے موقع پر حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے آپ کو خصوصی ذمہ داریاں سونپی جاتیں۔

راوی:

(1) خواجہ دل محمد، شرپور شریف ایم۔ اے ایم۔ ایڈ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر

(2) شیخ مسعود احمد ابن حاجی بابو محمد دین

ماہنامہ نور اسلام، اپریل 1995ء



## تبادلہ قسمت

- ☆ زمین کے تباوے کے ساتھ ساتھ قسمت کا تبادلہ بھی ہو گیا۔
- ☆ علم کے میدان سے بھاگا ہوا علماء کے منہ بند کرنے لگا۔
- ☆ جو بڑے بڑے افسروں سے مرعوب نہ ہوتا تھا اس کے گریبان کو جب ایک ولی اللہ نے پکڑا تو ایک لفظ بھی اس کی زبان پر نہ آ سکا۔
- ☆ ولی کامل نے جو کہا کر کے دکھلایا۔

کہتے ہیں چھاپے خانے کی ایجاد نے لوگوں کے حافظے کو کمزور کر دیا ہے اور لاؤڈ سپیکر کی ایجاد نے لوگوں کی آواز کا دم خم چھین لیا ہے۔ یہ بات درست ہے یا غلط ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں مگر ہم آپ کو اس دور میں ضرور لے جانا چاہتے ہیں جب لاؤڈ سپیکر کے بغیر بھی ہزاروں کا مجمع جھوم جھوم جاتا تھا اور مقرر کو یہ یقین ہوتا تھا کہ اس کی آواز مجمع کے آخری سامع کے کانوں کو چھو رہی ہے۔

آج شرپور شریف کے نام سے کون واقف نہ ہو گا۔ مجھے اٹلی سے ایک خط آیا جس پر پتہ یوں درج تھا محمد انور قمر شرپوری، شرپور شریف۔ نہ تحصیل، نہ ضلع، نہ ملک (پاکستان) کا نام لکھا تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرپور شریف کا نام دنیا کے گوشے گوشے تک معروف ہے۔ شرپور شریف کو یہ شہرت کیسے ملی؟۔ صرف اور صرف بہا کی روحانی ہستی اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرپوری رحمۃ اللہ علیہ



کے مولد، مسکن اور مدفن ہونے کی وجہ سے۔

بیسویں صدی کی ربع اول سے آج تک لوگ شرقپور شریف میں حاضری کو ایک سعادت سمجھتے ہیں یہاں کی گلیاں اور بازار آج بھی بیرونجات کے زائرین سے پر رونق رہتے ہیں یہاں، آکر لوگوں کو ایک قلبی سکون اور راحت ملتی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں روافض نے بھی اپنی مجالس کی بنیاد رکھ دی تھی، ظاہری طور پر لوگ ان کی مجالس میں حاضری کی غرض سے آتے تھے مگر حقیقتاً وہ شرقپور شریف کی حاضری کی سعادت چاہتے تھے۔ ۲۶ نومبر ۱۹۱۹ کو محرم کا آغاز ہوا تو ان مجالس میں شریک ہونے والوں کی اکثر زبانوں پر ایک نئے ذاکر کا نام تھا۔ وہ ایک دوسرے کو شبیہ ذوالجنح کے موقعہ پر ضرور آنے کی تلقین کر رہے تھے۔

شبیہ ذوالجنح والے دن گرمی کے باوجود لوگ جوق در جوق آنے لگے مجلس کا آغاز ہو چکا تھا، مصائب اہل بیت سن کر لوگ گریہ کنناں تھے، لوگ سروں کو پیٹ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بے جا رہے تھے کہ اچانک شاہ صاحب زندہ باد کا نعرہ لگا لوگ رونائینا بھول گئے۔ اس نعرہ کے جواب میں سب شامل ہو گئے اٹھ اٹھ کر دیکھنے لگے اور دیکھ دیکھ کر ہر کوئی شاہ صاحب کی آمد آمد کا مژدہ سنانے لگا۔

یہ نووارد پورے قد کا خوبصورت جوان تھا بغیر ڈاڑھی کے گورا چٹا رنگ دعوت نظارہ دے رہا تھا اور سرمہ لگی آنکھیں قیامت برپا کر رہی تھیں۔ لمبی لمبی مونچھیں ان کی وجاہت اور رعب کی عکاس تھیں۔ لوگ انہیں دیکھتے رہے، نعرے لگاتے رہے اور سامعین میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک نہیں بیٹھا جب تک اس نے آپ کو



ایک جھلک دیکھ نہیں لیا، یہی نووارد تو ان کے دلوں کی دھڑکن بن کے آج آیا تھا اسے سننے کے لئے تو شیعہ لوگوں نے خوب پرچار کر رکھا تھا، عزادار جو مجلس سے باہر گھوم پھر رہے تھے وہ بھی آگئے۔

شاہ صاحب سیچ پر بیٹھے واقعتاً سیچ ج گئی آپ ہر ایک کے مرکز نگاہ بن چکے تھے سچی بات تو یہ ہے کہ آپ امیر الامراء دکھائی دے رہے تھے کھلی آستینوں والی سفید قمیض، گلے میں سیاہ پٹکا اور بکھری ہوئی زلفیں لٹے ہوئے کارواں کے امیر کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔

جب شاہ صاحب کی باری آئی تو مجلس پڑھنے کے لئے اٹھے۔ صلوٰۃ و سلام کے بعد آپ نے فرمایا۔

وہم پیندی سے فوجاں دے وچہ نالے شور مچدا اوہ آیا اوہ آیا حیدر آیا

کفر نسدا جان بچا ونے نوں نالے آکھدا اوہ آیا اوہ آیا حیدر آیا

سامعین پر سحر چھا گیا تمام لوگ اس طرف یوں دیکھنے لگے گویا واقعی حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہ تشریف لا رہے ہیں۔ ازاں بعد آپ نے مصائب پڑھے تو ہر ایک کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ آہ و بکا کا شور اٹھنے لگا چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، لوگوں کی نگاہوں کے آگے کربلا کے میدان کا نقشہ کھچ گیا۔ شاہ صاحب خود بھی رونے لگے، انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے بیان کو ختم کیا۔ اور سیچ سے نیچے اتر آئے۔

منتظم مجلس سے اجازت لے کر تشریف لے جانے لگے تو ایک تھالی میں کچھ نقدی آپ کی خدمت میں پیش کی گئی مگر آپ نے یہ نقدی نہیں لی، فرمایا میں مجلس پڑھنے کی اجرت نہیں لیا کرتا جن کا ذکر کیا ہے وہی سب کچھ دیں گے۔

منتظم مجلس بڑے حیران ہوئے کہ اس قدر بہترین ذاکر مگر مجلس مفت پڑھتے ہیں حیرانی ہے۔ منتظم مجلس نے کہا شاہ صاحب قبلہ آپ نے جانا تو ہے ہی مگر تھوڑی دیر رک جائیے کیونکہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسجد میں آنے کا وقت ہو گیا ہے ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کو بازار میں مل جائیں اور آپ پر ناراض ہوں۔

میاں صاحب! کون سے میاں صاحب؟ شاہ صاحب نے پوچھا۔

حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہاں کی بڑی کامل ہستی ہیں کوئی انہیں آنکھ بھر کے دیکھ نہیں سکتا۔

کس برادری سے میاں صاحب کا تعلق ہے؟

وہ آرائیں برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

تو پھر کیا ہے میں سید زاوہ ہوں وہ تو ہمارے امتی ہیں مجھے ان سے خوف کس لئے

ہوگا۔

اگر میرے ساتھ ان کا سامنا ہو گیا تو پھر لطف ہی آجائے گا۔

بہر حال شاہ صاحب نہیں مانے اور اجازت رخصت لے کر چل دیئے ادھر میاں

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیٹھک میں بھی شاہ صاحب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی،

کسی نے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بتایا کہ آج چک نمبر ۱۴ سے آئے ہوئے ایک



سید صاحب نے مجلس میں کمال کے مرثیے پڑھے ہیں ان کی مرثیہ خوانی کی دھوم مچ گئی ہے۔

ہاں ان کے مرثیوں کی آواز میرے کانوں تک بھی پہنچی ہے بڑی اچھی اور سریلی آواز میں پڑھتے ہیں۔

اب اتفاق دیکھئے ادھر شاہ صاحب بازار میں سے گزر رہے ہیں ادھر سے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے آئے احباب نے بتایا یہی وہ شاہ صاحب ہیں جنہوں نے شیعوں کی مجلس میں آج مرثیے پڑھے ہیں۔

جب آنا سامنا ہوا تو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے گریبان میں ہاتھ ڈال کے فرمایا تمہارا نام کیا ہے؟ بولے ”نور الحسن“۔

اچھا نور الحسن! جی چاہتا ہے ہم آپ کو نور الحسن ہی بنا دیں۔ یہ خاموش رہے حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ نہ سمجھ سکے۔ اور گھر تشریف لے گئے۔

مگر یہاں تو حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ چین کیسے آسکتا تھا۔

فارغ تو بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا

یا اپنا گریبان چاک یا دامن یزداں چاک

شاہ صاحب شب و روز بے چین رہنے لگے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ راتوں کی نیدیں طراپ کی نذر ہونے لگیں۔ چہرے پر اویسیاں مچنے لگیں۔ ایسے لگتا

تھا کہ لٹ چکے ہیں۔ جان و دل ہی کھو بیٹھے ہیں بس جدھر دیکھنے لگے ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہی رہے۔

کباب سیخ تھے وہ کروٹیں ہر سو بدلتے تھے  
جو جل اٹھتا تھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے تھے

کوئی پوچھتا تو کہتے میں تو بڑے ٹھاٹھ والے افسروں سے مرعوب نہ ہوتا تھا پتہ  
نہیں اس نحیف سے مرد کامل نے مجھے کیا کر دیا ہے؟ اس قدر رعب چھا گیا ہے کہ  
زبان ہی بے حرکت ہو گئی ہے۔

ناظرین کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت سید نور الحسن شاہ صاحب کی زمین رقبہ  
تقریباً "ایک مربع چک نمبر ۱۴ میں تھی جس کا انتظام زراعت و کھیتی باڑی آپ کے ذمے  
تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ اس زمین کا تبادلہ کیلیانوالہ میں ہو جائے۔ آپ اپنے بڑے  
بھائی حضرت سید حسین شاہ صاحب کی معیت میں شرقپور شریف میں تشریف لائے تاکہ  
پٹواری قانون گو اور گرداور وغیرہ سے مل کر زمین کے تبادلے کی بات ہو سکے۔ شاہ  
صاحب نے اپنے بھائی سے کہا کہ پہلے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مل لیں۔

چنانچہ دونوں بھائی اعلیٰ حضرت حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدمت  
میں حاضر ہوئے۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا شاہ صاحب طبیعت کیسی ہے؟  
اور کیسے آنا ہوا؟ عرض کیا گیا حضور! چک نمبر ۱۴ والی زمین کا تبادلہ کیلیانوالہ میں کرنا  
چاہتے ہیں۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا زمین کا تبادلہ تو اللہ تعالیٰ کر ہی دے گا۔ ہم



آپ کی قسمت کا تبادلہ آج ہی نہ کروادیں؟ یہ تبادلہ زمین کے تبادلے کی نسبت بہت ضروری ہے۔ شاہ صاحب اب بھی جواب نہیں دے سکے، بس سر جھکائے بیٹھی رہے مگر یہ احساس ضرور ہونے لگا کہ دل کی آگ بھڑکنے کو اور ایندھن مل گیا ہے۔

دونوں بھائی اجازت لے کر واپس چک نمبر ۱۴ میں آگئے مگر کیلیانوالہ میں اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سید حسین شاہ صاحب نے عرض کیا کہ شریفور شریف کے ایک اللہ کے بندے نے انہیں فرمایا کہ تمہیں نور الحسن بنا دیا جائے، تو یہ خاموش رہے اور جب انہوں نے فرمایا کہ تمہاری قسمت کا تبادلہ کر دیں، تو بھی ان کے لبوں پر خاموشی محو رقص رہی۔

والدہ محترمہ نے نور الحسن شاہ صاحب سے پوچھا۔ بیٹا تم نے ایسا کیوں کیا؟ شاہ صاحب نے عرض کی امی! آپ جو میرے مرشد ہیں آپ ہی مجھے سب کچھ بنا سکتی ہیں۔

اس پر والدہ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو میں آج سے تمہاری مرشد نہیں ہوں گویا یہ والدہ ماجدہ کی طرف سے بیعت کی اجازت تھی۔

پھر کیا تھا بے چینوں اور بے قرار یوں نے آپ کو گھیر لیا۔ شریفور شریف کی گلیاں کوچے اور بازار آپ کی نگاہوں میں رہنے لگے یہاں آنے کا کوئی بہانہ چاہتے تھے کہ سائیں الہ داد برج تاشہ والے (برج تاشہ کیلیانوالہ سے بمشکل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے) ان کو بھی چک نمبر ۱۴ میں مربع ملے ہوئے تھے۔ وہ آپ کو شریفور شریف میں لانے کا بہانہ بن گئے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ ہمارا کھال



چونکہ بہت دور ہے اس لئے ہمارے کھیتوں تک پانی نہیں پہنچ پاتا۔ آپ چونکہ محکمہ نہر میں ٹھیکیداری کا کام کرتے ہیں اگر گزارش کر کے ہمیں نزدیک سے کھال منظور کروادیں تو بہت اچھا ہے۔

آپ چونکہ فقیروں کی بہت عزت کرتے تھی اس لئے اسی دن پچھلے پہر چل پڑے اور اڑے پر رات گزاری اور صبح کو ضلع دار جو کہ سکھ تھا، کے پاس آئے وہ بڑے تپاک سے ملا۔ چونکہ وہ نہانے جا رہا تھا کہنے لگا، ایک دو گھنٹہ کے بعد تشریف لانا۔ آپ کا کام آپ کی منشاء کے مطابق کر دیا جائے گا۔ میں ذرا نہادھو کر فارغ ہو لوں۔ چنانچہ آپ دونوں بازار میں تشریف لے آئے۔ سائیں الہ داد نے عرض کیا چلو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مل لیں۔ شاہ صاحب تو پہلے ہی بہانہ چاہتے تھے۔ وہ بہانہ بار بار آپ کو ہاتھ لگنے لگا۔ شاہ صاحب نے کچھ پھل وغیرہ خریدے اور سائیں الہ داد کی چادر میں ڈالے پھر حاضر دربار ہونے کے ارادے سے چل پڑے۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت لوہاراں والی مسجد میں تشریف فرماتھے۔ دونوں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھل پیش خدمت کیا جو آپ نے قبول فرمایا۔ اور حلقہ نشینوں میں یہ پھل بانٹ دیا باقی سب کو ایک ایک دیا مگر شاہ صاحب قبلہ کو دو عنایت فرمائے اور کمال مہربانی سے پیش آئے۔

اب آپ نے شاہ صاحب سے دریافت فرمایا آؤ کیسے آنا ہوا؟ عرض کیا الہ داد کے ساتھ پانی کے کھال کے لئے ضلع دار کے ہاں آئے تھے ”جاؤ پہلے وہ کام کر لو اگر دوبارہ ملنا ہو تو مولوی محمد شفیع والی مسجد میں مل لینا۔“



چنانچہ شاہ صاحب اور سائیں الہ داد ضلع دار کے ہاں چلے گئے ضلع دار نے کمال محبت سے پانی کے کھل کا کام ان کی حسب منشاء کر دیا پھر پوچھا کہاں گئے تھے؟ سائیں الہ داد نے کہا میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں۔ سکھ ضلع دار دونوں کے پاؤں چومنے لگا۔ کہ آپ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان ہیں ہمارے لائق کوئی اور خدمت ہو تو میں ہر طرح حاضر ہوں۔ یہاں سے نکلے تو سائیں الہ داد نے شاہ صاحب سے عرض کی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ اگر دوبارہ ملنا چاہو تو مسجد مولوی محمد شفیع والی میں آجانا۔ میرا خیال ہے ان سے مل لینا چاہئے یہ حاضری نہایت ضروری ہے۔ آپ دوبارہ حاضر ہو گئے اور حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نیاز حاصل کیا۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے خوش ہوئے سائیں الہ داد کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔

”ایسے بابے کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔“

قبلہ شاہ صاحب آگے بڑھے اور سرپا نیاز بن گئے۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کھینچ کر قریب کر لیا۔ سورۃ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تلاوت فرمائیں اور فرمایا تم کو بتانا کیا ہے کبھی کبھی آکر ہو جایا کرو۔ پھر جانے کی اجازت دے دی۔

یہ اجازت شاہ صاحب نے خود نہیں مانگی تھی وہ اجازت کیوں مانگتے؟ وصل کے بعد ہجر میں تڑپنے کی اجازت کون مانگتا ہے؟ شاہ صاحب تو بس اسی آستانہ کے خادم ہو کے رہنا چاہتے تھے اس شہر تجلیات میں بس جانا چاہتے تھے۔ مگر بسنا تو وہ ہوتا ہے جو اپنی



مرضی سے نہ بسا جائے بسانے والے کی مرضی دیکھی جائے۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو ابھی اس کے جذبہ عشق میں اور ہلچل چاہتے تھے اسے پختگی کی آگ میں اور جلاتا چاہتے تھے۔

اب آپ کو بھیج دیا گیا مگر ڈوری کا سرا حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں رہا۔ جب چاہتے کھینچ لیتے۔ اور پھر ایک منزل ایسی آئی کہ نور الحسن یہیں کے ہو رہے۔ اور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل قلیل عرصے میں شاہ صاحب کو منتہی فرمادیا اور اپنی توجہ خاص سے آپ کے طرف عالی کو ایک نظر میں بھرپور فرما کر اس کو معراج کمال تک پہنچادیا جہاں پر ایک عالم سالک سا لہا سال کے مجاہدہ سے بھی نہیں پہنچ سکتا، نہ صرف مریدین کے حلقے تک رکھا بلکہ خلفاء کی صف میں بھی کھڑا کر دیا اور تعلقات میں قربت اس قدر ہو گئی کہ محبوب و محب میں پہچان مشکل ہو گئی۔ طبیعت کو عاشقانہ سوز مل گیا اور دونوں کے راز و نیاز مشترک بن گئے اور من و دگر و الا امتیاز مٹ گیا۔

حضرت صاحبزادہ محمد عمر بیربل والے ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ حضرت قبلہ کے حکم بموجب حضرت حاجی عبدالرحمن صاحب و دیگر احباب حضرت شاہ صاحب سے جانے کے لئے اصرار کرتے تھے مگر یہ جانے کا نام نہ لیتے تھے۔ بلکہ الٹا ان لوگوں سے کہتے میں چلا گیا تو حضرت قبلہ آپ لوگوں پر ہی ناراض ہوں گے۔ آپ سب کو کیا معلوم کہ حضرت مخدوم کس زبان سے اور کس دل سے مجھے جانے کو فرماتے ہیں۔ آپ لوگ میرے معاملے میں دخل نہ دیا کریں یہ بھی ٹھیک کہتے تھے۔ محبت کی رمز کو



محبوب ہی خوب جانتا ہے یہ اس شرف سعادت کو حضرت قبلہ کے حکم سے مقدم جانتے تھے سوز عشق سے جل کر کباب ہو چکے تھے اور حالت یہ تھی۔

مختصر حال چشم و دل یہ ہے  
اس کو آرام نہیں اس کو خواب نہیں

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی چوکھٹ پر پڑے رہے۔ آخر کئے سننے کے بعد جب گئے تو واپس آگئے مگر میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بغیر دل لگتا ہی نہیں تھا۔  
میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے خلفاء کی نسبت حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو زیادہ دیر تک اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں رہنے کا شرف حاصل رہا اس شرف خصوصی کے باعث آپ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سفر و حضر میں بھی ساتھ رہے۔

مگر جب اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تو چند روز پہلے آپ کو گھر بھیج دیا گیا شاید اس میں حکمت یہ ہو کہ جدائی کے لمحے قریب آنے والے ہیں اور یہ عاشق صادق اس صدمہ جانکاح کو برداشت نہ کر سکے گا۔

یوں آپ نے حضرت شاہ صاحب قبلہ کو نور الحسن بنا دیا اور قسمت کا تبادلہ کر دیا۔ اور پھر جو شخص قرآن مجید تک نہیں پڑھا ہوا تھا وہ قرآن مجید کے وہ نکات بیان فرمانے لگا جنہیں سن کر بڑے بڑے عالم دنگ رہ جاتے تھے، اگر آپ حضرت شاہ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ”الانسان فی القرآن“ کا مطالعہ کریں تو شاہ صاحب قبلہ کے علم قرآن پر عبور حاصل ہونے کا ثبوت ملے گا اور جو شخص ساتویں

جماعت سے آگے نہ چل سکا ہو وہ عربی اور فارسی زبان کے رموز کیسے سمجھ سکتا ہے؟  
محض اس وجہ سے کہ اس کے قلب کے اندر کسی ولی کامل کی نگاہ جھانک رہی ہے اس  
لئے وہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے علم عروض کی زبان میں بت یوں  
کرتا ہے۔

افضل و اکمل مکمل راہنمائے کلاماں  
ملتجائے بے کساں ہم مرثدہ افسردگیاں  
حامی دین متین و فخر عزت خواجگیاں  
صاحب درد و فغان را سر عاشق صادقان  
بے کنارہ بحر عرفان بادشاہ عارفان  
مظہر جلی سر خفی سر از سر نہاں  
عاشق و محبوب رب العالمین را بیگماں  
ہست مخفی از عوالم راز دانا راعیاں  
نقطہ نور احد از نور احمد مجتبی  
نور نبی نور خدا نور محمد مصطفی

حوالہ جات

مضمون کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی۔

۱۔ اولیائے نقشبند از محمد امین شرپوری۔



۲۔ رسالہ مہک گو جزانوالہ نمبر۔

۳۔ انشراح الصدور بتذکرۃ النور از سید منیر حسن شاہ جو کالوی۔



## ”نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں“

☆ مرد کامل کی بارگاہ میں حاضری سے رسوائیاں خوش بختی میں بدل جاتی ہیں۔

☆ علامہ اقبال کی زندگی کا ایک روشن پہلو۔

☆ مرد کامل بعض اوقات اشتیاق میں شدت پیدا کرنے کے لیے ملاقات سے انکار کر

دیتا ہے۔

☆ علامہ اقبال مرد قلندر کی بارگاہ میں آنے کے بعد مرد قلندر بنا۔

ایسے لگتا ہے جو بات فضائے عالم میں کر دی جائے وہ ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہو

کر دور دور کے لوگوں کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے لوگوں کے کان اسے محفوظ بھی رکھتے

ہیں اور اس کے اثرات دیکھنے کے منتظر بھی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ لوگ اپنی اپنی

قیاس آرائیوں کی بناء پر مختلف مطلب بھی اخذ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ایسی

آواز سے خائف رہتے ہیں اور بات کرتے وقت بڑی احتیاط بھی کرتے ہیں۔

یہ اپریل 1911ء کی بات ہے انجمن حمایت اسلام لاہو کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا کہ

ایک تیس پینتیس سالہ نوجوان سیچ پر ٹہلتے ٹہلتے بڑی خوش الحانی کے ساتھ ایک نظم سنا



رہا تھا۔ پنڈال میں حدنگاہ تک لوگ ہی لوگ تھے۔ پورے مجمع پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کیا مجال کہ سوئی گرے اور اس کی آواز نہ سنائی دے۔ لوگوں پر ایک محویت کا عالم تھا۔ وہ ایک ایک شعر پر جھوم رہے تھے اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں کہیں کہیں سنائی دے رہی تھیں۔

پانچ چھ شعر پڑھنے کے بعد شاعر نے ذرا مسکرا کے کہا۔

اے خدا! شکوہ ارباب وفا بھی سن لے

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

لوگوں نے کان کھڑے کیئے کہ وہ بھی شکوہ سنیں جو اقبال خدائے اعلیٰ و برتر سے

کرنا چاہتا ہے۔ شاعر نے قبل از اسلام کا منظر پیش کیا۔ پھر اشاعت اسلام کی بات کی۔

اور عروج اسلام کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے، نوع انسان کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم

نے تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

بس پھر شکوہ و شکایت شروع ہو گئی۔ اقبل بے باکی سے کہنے لگا۔

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ

نہیں

اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور

اور بیچارے مسلمان کو فقط وعدہ ء حور

کبھی ہم سے، کبھی غیروں سے شناسائی ہے

بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

پھر یہ آزدگی غیر سبب کیا معنی

اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی

اب لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ بعض لوگوں نے ان

اشعار کو پسند نہیں کیا۔۔۔۔۔ جلسہ ختم ہو گیا۔ مگر لوگ منڈلیوں میں کھڑے ہو کر انہی

اشعار کو زیر بحث لاتے رہے۔۔۔۔۔ پھر جلسے کے ایک دو دن بعد جمعہ تھا۔ خطیب منبر نے

بھی ان ہی اشعار کا تذکرہ کیا۔ خوب کھل کر تنقید کی۔ لفظ و معانی کی بخجہ دری کی۔ اور

تان اس پر توڑی کہ یہ اشعار نہایت گستاخانہ ہیں۔ خدا کی ذات کے بارے میں ایسی



گستاخی کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے اور اگلے لمحے علامہ اقبال پر کفر کا فتویٰ داغ دیا گیا۔ یہ فتویٰ لوگوں کی زبان پر آیا اور اخبارات میں بھی شہ سرخیوں کی ساتھ چھپ گیا۔

علامہ اقبال کے ہمنواؤں اور مخالفین میں خوب لے دے ہوئی۔ مخالفین نے علامہ اقبال کو دائرہ کفر میں پھانسنے پر خوب اصرار کیا اور موافقین نے انہیں اس دائرے سے نکلنے کی کوشش کی۔

علامہ اقبال نے جب اس فتوے کو دیکھا اور مخالفین کی باتیں سنیں تو پسچ کر رہ گئے۔ انہوں نے بڑا کہا کہ اشعار کاجو مطلب آپ لوگوں نے نکالا ہے وہ درست نہیں ہے۔ لہذا کفر کا فتویٰ بھی مناسب نہیں۔ مگر ایک لہر تھی جس میں پڑھے لکھے لوگ بھی بے جا رہے تھے۔

تقریباً ایک سال کے بعد 1912ء میں موچی دروازہ میں ایک جلسہ عام میں حضرت علامہ اقبال نے اپنی ایک دوسری نظم اسی بحر اور زمین میں پیش کی یہ نظم اس پہلی نظم کا جواب تھی۔ وہ شکوہ تھا۔ یہ جواب شکوہ۔ وہ ایک سوال تھا یہ اس کا جواب تھا۔ شاعر نے اس نظم میں ایک ایک جزو کا جواب دینے کی کوشش کی تھی یہ نظم سن کر بھی لوگ خوب جھومے تھے۔ واہ واہ کے ڈونگرے برسائے تھے۔ اکثر لوگوں کی اس نظم

سے تسلی ہو گئی۔ اب ایک معترض کے سامنے تین چار آدمی جواب دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ مگر محراب و منبر کے امین حضرات نے علامہ اقبال کو معاف نہیں کیا اور نہ ہی ان پر لگایا گیا فتویٰ واپس لیا۔

اسی طرح 1926ء میں جب علامہ اقبال نے صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابات کے لیے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو انہیں اپنے انتخابی جلسوں میں لوگوں کی جو جو باتیں سننا پڑیں انہوں نے علامہ اقبال کو پریشان کر دیا۔ مثلاً ”موچی دروازہ میں ایک انتخابی جلسہ میں جب علامہ اقبال تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے ان کی تقریر سننے سے انکار کر دیا ایک طرف سے آواز آئی علامہ اقبال اپنے عقیدے کا اظہار کریں۔ دوسری طرف سے ایک شخص بولا اپنے مذہب کی وضاحت کیجئے۔ تیسری آواز آئی یہ سیٹ مسلمانوں کے لیے ہے کافر کے لیے نہیں۔“

علامہ اقبال کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ آج وہ اپنے دلائل کھل کر نہ دے سکے جلسے کا رنگ پھیکا رہ گیا۔ علامہ اقبال کو اپنے اکثر انتخابی جلسوں میں ایسے ہی حالات کا سامنا رہتا۔ تاہم خدا کو ان کی کامیابی منظور تھی۔ 23 نومبر 1926ء انتخاب کا دن تھا۔ انہوں نے واضح اکثریت حاصل کی وہ کامیاب ہوئے مگر کفر کا فتویٰ جوں کا توں قائم تھا چودہ پندرہ سال گزر جانے کے باوجود ہوانے اس فتویٰ کو محفوظ رکھا تھا علامہ اقبال کو



ایک گھن لگ گیا تھا اور وہ اندر ہی اندر سے انہیں کھائے جا رہا تھا۔

علامہ اقبال کے ہاں شعرو سخن کی ایک محفل تقریباً "روزانہ منعقد ہوتی تھی۔ اس محفل میں پڑھے لکھے لوگوں کی علاوہ بعض ان پڑھ قسم کے لوگ بھی اپنا شوق لے کر حاضر ہوا کرتے تھے ایسے لوگوں میں شیخوپورہ سے حاجی معراج دین (جو اس وقت حاجی نہیں تھے) اپنے چھ دوستوں کے ساتھ اپنی سائیکلوں پر آتے اور اس محفل میں آکر لطف اٹھاتے تھے۔

(حاجی معراج دین ابھی تک بقید حیات ہیں اور ۱۱۲ سال کی عمر کے باوجود صحت مند ہیں ان کا جسم بڑا مضبوط ہے۔ ابھی تک سیدھی کمر رکھ کے چلتے ہیں۔ ذرا خم نہیں آیا۔ جنڈیالہ روڈ شیخوپورہ میں ان کی رہائش ہے)

ایک دن علامہ اقبال نے ان نوجوانوں سے پوچھا کہ بیٹا! تم کہاں سے آتے ہو۔ تم بس ہماری ہی باتوں کو سنتے رہتے ہو اپنی بات تم نے کبھی نہیں سنائی۔

ہمیں بس آپ کے شعر سننے کا شوق ہے۔ ہم سائیکلوں پر شیخوپورہ سے آتے ہیں اور سائیکلوں پر ہی واپس جاتے ہیں۔ ایک نوجوان نے کہا۔

آپ شیخوپورہ سے آتے ہیں۔ اس شیخوپورہ سے جسے شہزادہ سلیم (شیخو بابا) نے آباد کیا اور جس کے قریب ہرن مینار بھی ہے علامہ اقبال نے فرمایا۔

جی! بالکل وہی شیخوپورہ۔ نوجوان نے جواب میں عرض کیا۔  
 اگر میں آپ کے پاس آؤں تو تم میری کیا مدد کرو گے۔ اقبال نے کہا۔  
 ہم دل و جان آپ پر نچھاور کر دیں گے۔

دیکھو نوجوانو! میں یہاں شہری آبادی میں بے حد پریشان رہتا ہوں۔ چاہتا ہوں کسی  
 ویرانے میں جا کر چند دن گزاروں۔ دن رات روتا رہوں۔  
 نہیں میاں جی ہم آپ کو رونے نہیں دیں گے۔ آپ کی خوب سیوا خدمت  
 کریں گے۔ آپ ہمیں اپنے عمدہ عمدہ شعر سنائیں گے نا۔ ایک نوجوان نے کہا۔  
 ضرور سناؤں گا۔

دن تاریخ طے ہو گیا اور علامہ اقبال مقررہ تاریخ پر بذریعہ ٹرین شیخوپورہ میں پہنچے۔  
 یہ ساتوں نوجوان ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے علامہ صاحب کو ایک  
 تانگے میں بٹھا لیا اور کھانے کا سامان بھی رکھ لیا۔ پھر ان کی خواہش کے مطابق انہیں  
 ہرن مینار تک لے گئے۔

تلااب کے اندر والی عمارت کی آخری منزل پر علامہ اقبال نے پانچ دن قیام فرمایا۔  
 آپ نے یہ پانچوں دن سجدہ ریزی اور رونے میں گزارے۔ پانچویں دن علامہ صاحب  
 نے ان نوجوانوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنے پاس بلایا اور فرمایا۔



نوجوانو! آپ نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ آپ کا بڑا بڑا شکریہ۔ اب میں پھر واپس اپنی پریشانیوں کے دیس میں جانا چاہتا ہوں۔

میاں جی آپ تو بڑے خوشحال ہیں۔ پریشانیاں آپ کو کیسے لاحق ہو گئیں۔

ہاں بیٹا! میں سخت پریشان ہوں اور شاید مرنے تک پریشان رہوں۔

آخر آپ پریشان کیوں ہیں؟ آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ آپ جیسے لوگ تو دوسروں کی پریشانیاں دور کیا کرتے ہیں۔

ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر پریشانیاں جن لوگوں کا مقدر بن جائیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

میاں جی! آخر آپ کو پریشانی ہے کیا؟ اپنی پریشانی کا اظہار تو کریں۔ ہم سات نوجوان یقیناً آپ کی پریشانی کا بوجھ ہلکا کر دیں گے۔ آپ کی پریشانی ہم آپس میں بانٹ لیں گے۔

پیارے نوجوانو! میری پریشانی کسی سے بانٹی جانے والی نہیں ہے۔

میاں جی کچھ بتائیں تو سہی۔

دیکھو نوجوانو! میں جب دوسرے لوگوں سے اپنا مقابلہ کرتا ہوں تو اکثر کی نسبت

اپنے میں کم برائیاں پاتا ہوں۔ جس کی بنا پر اپنے آپ کو ان لوگوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔

مگر جن لوگوں کو اللہ نے اچھے برے لوگوں میں امتیاز کرنے کی صلاحیت دی ہے۔ انہوں نے مجھے کافر کہہ دیا ہے۔

کافر کہہ دیا ہے؟ کیوں۔ کس لیے۔ نہیں نہیں میاں جی آپ کافر کیسے بن گئے۔ کس نے آپ کو کافر کہا؟ کب کہا؟

جنہیں اللہ نے دین کی سمجھ دی ہے انہوں نے آج سے چودہ پندرہ سال پہلے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا ہے اور وہ کفر کا فتویٰ اب تک قائم ہے۔ اسی بات نے مجھے پریشان کر رکھا ہے سوچتا ہوں۔ میرے پاس تو پوری دنیا کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کا پروگرام ہے۔ چاہتا ہوں ان میں اتحاد پیدا ہو انہیں ان کی منزل دکھاؤں۔ ان کے سفر کی سمت متعین کروں۔

اگر میں کافر رہا تو مجھ کافر کی باتوں پر کون یقین کرے گا۔ میں مر گیا تو مجھے کس قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ مسلمانوں کے قبرستان میں یا کافروں کے قبرستان میں۔ یہی پریشانیاں مجھے اندر سے کھائے جا رہی ہیں۔

میاں جی! آپ ایسا کریں۔ شرق پور شریف میں جائیں۔ وہاں پر ایک ولی اللہ ہے۔ میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کا نام ہے۔ بڑے مرد کامل ہیں۔ جو بات فرمادیں اللہ اسے پوری کر دیتا ہے۔



ہاں میں نے ان کا نام سن رکھا ہے۔ واقعتاً وہ ایسے ہی بزرگ ہیں مگر ان کی خدمت میں جانے کا مجھے شرف حاصل نہیں ہوا۔ میں انشاء اللہ ضرور ان کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ (یہ 1927ء کی بات ہے)

علامہ اقبال گھر گئے۔ دوست احباب ملنے کے لیے آئے ان میں آپ کے گھرے دوست سر محمد شفیع بھی تھے۔

سر محمد شفیع اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرپوری کے خالہ زاد بھائی تھے۔ انہیں آپ (علامہ اقبال) تخلصیٹے میں لے گئے۔ فرمایا۔ میاں صاحب! آپ کے بھائی حضرت میاں شیر محمد صاحب شرپوری شرپور شریف میں رہتے ہیں ان کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ ملنے کی اجازت لے دیں تو زہے قسمت۔

سر محمد شفیع وقت نکال کر ایک دن حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا کہ ان کے دوست علامہ اقبال آپ کی خدمت میں قدم بوسی کا شرف چاہتے ہیں اگر اجازت مل جائے تو میں انہیں کسی وقت لے آؤں۔

وہ بھی آپ کی طرح بے ریش ہوں گے۔ آپ نے میری رشتہ داری سے کیا اثر قبول کیا ہے کہ آپ کے دوست یہاں آکر میری بات مانیں گے؟ نہ لائیں انہیں یہاں میرے پاس۔

جب سر محمد شفیع لاہور چلے گئے اور علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی تو علامہ صاحب

نے ملاقات کی اجازت کے بارے میں دریافت کیا۔

سر محمد شفیع نے انہیں بتایا کہ یہ اجازت انہیں نہیں مل سکی۔ علامہ صاحب اسی

وقت رونے لگ گئے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ عرض کیا۔

دیکھو میرے دوست گنہگار کدھر جائیں آپ ان کے بھائی ہیں کوئی رشتہ داری کا

حق جتائیں۔ کوئی منت سماجت کریں۔ کوئی واسطہ دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو

ناکام واپس نہیں لوٹائیں گے۔

سر محمد شفیع ہفتے عشرے کے بعد دوبارہ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور علامہ اقبال کی بے قراری کا ذکر کیا بڑی لجاجت اور انکساری سے انکے لیے

آپ سے پھر اجازت مانگی۔

آپ نے تھوڑی دیر مراقبہ فرمایا پھر کہا اچھا لے آؤ۔

سر محمد شفیع کا چہرہ کھل گیا مسرت کھیلنے لگی وہ خوشی خوشی سیدھے علامہ صاحب

کے ہاں پہنچے اور ملاقات کی اجازت کی نوید سنائی۔

علامہ اقبال کا سر یکدم جھک گیا ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہاں ہاں یہ خوشی

کے آنسو تھے وہ تو اسی وقت حضرت صاحب کی خدمت میں آنا چاہتے تھے مگر سر محمد



شفیع کی مصروفیت نے دو تین دن مزید تاخیر کر دی۔

بہر حال ایک دن کوئی دس بجے کے قریب یہ دونوں حضرات شرقپور شریف میں تشریف لائے۔ علامہ اقبال کو ملکنہ گیٹ میں ملکل والے ڈیرہ میں کھڑا کیا گیا اور خود سر محمد شفیع اعلیٰ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ علامہ اقبال صاحب آگئے ہیں اگر جازت ہو تو خدمت میں حاضر ہوں۔

آپ نے فرمایا۔ ہاں ٹھیک ہے آجائیں۔

سر محمد شفیع علامہ صاحب کو لینے کے لیے چلے گئے اور آپ اوپر والی بیٹھک میں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دونوں حضرات (سر محمد شفیع اور علامہ اقبال) بیٹھک میں آکر بیٹھ گئے۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ حضرت صاحب کے نیچے اترنے کی آواز آئی یہ دونوں بے ساختہ دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت صاحب تشریف لائے تو دونوں تعظیماً "کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے سر جھک گئے دونوں نے چپ سلاہ لی۔

حضرت صاحب نے فرمایا۔

اخلا! آج ہم جیسا کون ہے؟ کہ ہمارے ہاں اقبال آیا ہے۔ ایک خدام سے فرمایا کہ کسی حجام کو بلا لاؤ۔ ہماری داڑھی مونچھیں بھی ان جیسی بنادے ہاں ہاں آج اقبال جو ہمارے ہاں آگیا ہے۔

سر محمد شفیع کو اپنی حالت پہ قابو رہا مگر علامہ اقبال کی رقت بے قابو ہو گئی۔ انکی آنکھوں نے ساون بھلوں کی جھڑی لگا دی۔

حضرت صاحب نے سر محمد شفیع سمیت سب لوگوں کو باہر نکل دیا۔ اقبال کے کاندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا تو اقبال کو سکون مل گیا۔ عرض کیا حضور! گناہوں سے نفرت بجا ہے گناہگاروں سی ناروا۔ ہم پہلے ہی مایوسیوں کا شکار ہوتے ہیں اگر آپ بھی ٹھکرا دیں تو کدھر جائیں۔

حضرت صاحب نے بازو سے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔

ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں گناہگار سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ کہئے کیسے آنا ہوا ہم فقیروں کے پاس؟

اقبال کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔ رندھی ہوئی آواز میں عرض کیا کافر بنا دیا گیا ہوں۔ مسلمانوں کے زمرے میں داخل فرما دیجئے۔

اقبال! خدا کی رحمت رونے والوں کو بے حد پسند کرتی ہے۔ گھبرائیں نہیں آپ مسلمان ہیں۔ مسلمان ہی رہیں گے۔ آپ کو کافر کہنے والے تمہارا نام عزت سے لیں گی۔ منبروں پر تمہارے اشعار پڑھیں گے۔ تمہارے جن شعروں کی وجہ سے تم پر فتویٰ تکفیر لگا ہے وہ خود انہیں اکثر گنگناتے رہیں گے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا



چاہیے۔

رحمت حق بہانمی جوید

رحمت حق بہانہ می جوید

اب اقبال کو لنگر کا کھانا پیش کیا گیا۔ سر محمد شفیع کو بھی بلایا گیا۔ دونوں نے ماحضر

بڑے شوق سے تناول فرمایا۔ حضرت صاحب نے دعا فرمائی اور دونوں کو رخصت فرمادیا۔

اس حاضری کے بعد علامہ کی توقیر میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ علامہ اقبال کا یہ

شعر۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس واقعہ کی عکاسی کرتا ہے اور ”مرد مومن“ سے مراد اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد

صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرقپوری ہیں۔

علامہ اقبال 1927ء میں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور 1928ء میں حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا۔ اقبال اکثر اپنے

دوستوں سے کہتے کاش میں بہت پہلے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں

حاضر ہوا ہوتا۔

یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ اس حاضری کے بعد کسی بھی زبان پر یہ لفظ نہیں آیا کہ علامہ اقبال کافر ہے۔ اور یہ بات بھی ثبوت کو پہنچی کہ ہر مکتبہ فکر کے لوگ آج علامہ اقبال کے اشعار اپنی سٹیجوں پر جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں اور اپنے بیان کو مزین اور پر زور بناتے ہیں۔

حوالہ کے لیے: روایت حاجی معراج دین جنڈیالہ روڈ شیخوپورہ

مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب بھی پیش نظر رہیں۔

اقبالیات بی اے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

منبع انوار صابزادہ میاں جلیل احمد شرقپوری۔

رسالہ مہک (اقبال نمبر) گورنمنٹ کلج گوجرانوالہ۔

ماہنامہ نور اسلام اکتوبر 1993ء





## اک مرد رویش پولیس افسر

- ☆ نیکو کار لوگوں کا تعلق انسان کو نیک بنادیتا ہے۔
- ☆ جب تھلنے بک جائیں تو تھلنے کا انچارج بد معاشوں کے ہاتھوں میں بک جاتا ہے۔
- ☆ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی اس کے بندوں کی شان میں گستاخی کرے۔
- ☆ مالک نیک ہو تو اس کے حیوانات بھی حلال و حرام میں تمیز کرنے والے بن جاتے ہیں۔

تزاخ سے ایک طمانچہ معصوم بچے کے رخسار پر پڑا بیچارہ لڑھکتا ہوا دور جاگرا۔ ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی جسے سن کر یقیناً "ہر ماں کا دل کانپ گیا ہو گا۔ اور ہر باپ کو مارنے والے پر غصہ ضرور آیا ہو گا۔ جلدی سے ایک دروازہ کھلا اور ایک نوجوان آگے بڑھا۔ اس نے بچے کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ یہ نوجوان اس بچے کا باپ کالے خاں تھا جو اپنے اکلوتے بیٹے کی کٹنا چھینے کی تکلیف کو بھی برداشت نہ کرتا تھا۔ اس نے بچے کی حالت کو دیکھا تو غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ وہ طمانچہ مارنے والے کو جان سے مار دینا چاہتا تھا مگر گاؤں (بھگتو ضلع گورداسپور) کے چوہدری کو دیکھ کر کچھ نہ کر سکا بس اتنا کہہ چوہدری جی! اس معصوم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟

چوہدری کالے خاں پر ناراض ہوا۔ کہنے لگا۔

اس کہنے سے کہہ دو آئندہ میرے بیٹے کے ساتھ نہ کھیلا کرے۔

مگر میرا بیٹا تو کسی کے ساتھ زیادتی کرنے والا نہیں۔ آپ نے ناجائز اسے

مارا ہے۔

لوگ اکٹھے ہو گئے۔ چوہدری اس بیچارے کی زیادتی نہیں بتا رہا تھا اور نہ کسی کی سنتا تھا۔ بس شور مچائے جا رہا تھا۔ بچے کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے خود روتے روتے بتایا کہ انجو (انجم سنگھ) نے مجھ سے ایک انٹی ادھار لی تھی واپس دیتا ہی نہیں تھا آج میں ذرا سخت لہجے میں انٹی کی واپسی کا تقاضا کیا تو گالیاں بکنے لگی۔ پھر مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر نیچے پٹخ دیا۔ تو یہ باپ کو بلا لایا ہے۔ اس نے (منگا سنگھ) اپنے بیٹے کی زیادتی اور جرم تو پوچھا ہی نہیں۔ بس آتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا ہے۔ باپ نے اپنی جیب سے انٹی نکال کے بیٹے کو دے دی۔ کہا

بیٹا! ہم غریب ہیں۔ امیروں کے ساتھ ہمارا کھیلنا اچھا نہیں ہے۔ تم اپنے جیسوں کے ساتھ کھیلا کرو۔ اپنی دنیا خود آباد کرو۔ امیروں کے ہاں نا انصافیاں اور سختیاں ہوتی ہیں۔ ان کی فطرت ہی غریبوں کو تنگ کرنے والی ہوتی ہے۔ اور ہم غریب تو بس ان امیروں کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے ہیں۔

رات کو بچہ سونے لگا تو اس کے دل میں سوچ اور فکر کے ان گنت جذبات موجزن تھے۔

کیا یہ دنیا صرف امیروں کے لیے ہے؟  
کیا یہاں حق اور باطل میں امتیاز کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے؟  
انصاف اور قانون کے محکمے حکومت کس لیے بناتی ہے؟  
اس چوہدری (منگا سنگھ) کو پکڑنے کے لیے پولیس کا سپاہی کیوں نہیں آیا؟



اگر سارے لوگ منگا سنگھ کا روپ دھار لیں تو خدا کی دھرتی سے امن و سکون اٹھ جائے۔ ایسے لگتا ہے محکمہ پولیس ہی کمزور ہے۔ اس محکمہ کے کارندے بس نام کے سپاہی اور تھانیدار ہیں۔ اگر اس محکمہ میں دیانت دار اور ہمت والے لوگ پیدا ہو جائیں تو امن و سلامتی کا دور دورہ دکھائی دینے لگے۔

بچے کی آنکھوں میں جب نیندیں آنے لگیں تو اس وقت وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر پولیس کے محکمے میں جائے گا اور جتنے بھی منگا سنگھ ہیں ان سب کی چمڑیاں دھوپ میں خشک کر دے گا۔

پھر یہ بچہ بے فکر ہو کے ایسے سویا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ بچہ خدا بخش تھا۔ جس کے باپ کا نام کلے خاں تھا۔

چند دنوں کے بعد بچے کی خواہش کے مطابق اسے حضرت علامہ سید سراج الحق شاہ صاحب گور داس پوری کے مدرسہ میں داخل کروا دیا گیا۔ شاہ صاحب چونکہ صاحب بصیرت اور صاحب نظر بزرگ تھے لہذا آپکے مدرسہ میں جو بھی طالب علم آیا، اس میں زندگی بھر حرام و حلال کی تمیز رہی۔

خدا بخش نے حضرت شاہ صاحب کے مدرسہ میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی اور قناعت پسندی کا درس بھی لیا۔

ازاں بعد یہ خدا بخش دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھگتو کے مقامی پرائمری سکول میں داخل ہوا۔ پہلے ہی دن سے جب یہ خدا بخش تختی اور قاعدہ پکڑے گھر میں آیا تو ماں نے پیار سے منہ چوم لیا۔ اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا آہا میرا بابو

آیا ہے۔ ماں کے منہ سی بابو کا لفظ نکلتا تھا کہ یہی بابو اس کے نام کا ایک حصہ بن گیا۔ اور زندگی بھر کے لئے یہ خدا بخش خان بہادر بابو خدا بخش بن گیا۔

بابو خدا بخش نے یہاں سکول میں اچھے لڑکوں کے ساتھ دوستی رکھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ انسان کی زندگی بنانے یا بگاڑنے میں اس کے دوستوں کا بڑا دخل ہے۔ اچھے دوستوں کا مل جانا بھی خدا کی خاص نعمت ہے۔

بابو خدا بخش کی دوستی کا حلقہ کوئی زیادہ وسیع نہیں تھا۔ صرف تین چار نیکو کار قسم کے دوست تھے۔ اکٹھے رہتے تو فضولیات میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے۔ پڑھائی کے سلسلے میں ایک دوسرے سے متبادلہ خیالات کرتے۔

بابو صاحب کے ایک دوست کا نام عبدالحمید تھا۔ اس کے بسترے میں سے ایک دن ناول کی کتاب نکل آئی، تو آپ اس سے ناراض ہو گئے کہنے لگے یہ ناول جھوٹے افسانے ہوتے ہیں جھوٹی معلومات کا ذخیرہ اگر ذہن میں جمع ہو جائے تو سچی باتوں کے لیے جگہ نہیں رہتی۔ میرے دوست! نصاب کی کتابیں پڑھا کرو۔

حمید نے کہا۔ یار! نصاب کی کتابیں تو کتنی بار دہرا چکا ہوں بلکہ حفظ ہو گئی ہیں۔ اچھا کل میں آپ کو ایک کتاب لا کر دوں گا، اسے پڑھا کریں۔

دوسرے دن بابو خدا بخش نے اپنے دوست کو جو کتاب دی وہ بزرگان دین کے حالات و واقعات پر مشتمل تھی۔ (غالباً) یہ کتاب تذکرۃ الاولیاء از حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ تھی۔

اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابو خدا بخش کو بزرگان دین کے حالات پڑھنے کا



بڑا شوق تھا۔

اس دوست (عبدالحمید) سے بابو جی کو کتنا پیار تھا؟ اس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ بابو خدا بخش نے اپنے ایک بیٹے کا نام بھی عبدالحمید رکھا۔ اس طرح وہ جب بھی اپنے بیٹے کو عبدالحمید حمید کہہ کے پکارتے تو انہیں ماضی کی ایک ایک بات یاد آ جاتی۔ بابو خدا بخش نے 1900ء میں مڈل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور پھر تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ 1901ء میں پولیس میں اکاؤنٹس کے شعبے میں کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔ چونکہ اس شعبے میں ہر فرد کو بابو کہا جاتا ہے۔ لہذا آپ کے نام کے ساتھ جو بابو کا اضافہ ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی نوکری کا آغاز ایک بابو کی حیثیت سے ہوا۔

6 سال تک اس شعبے میں کام کرنے کے بعد محکمہ پولیس میں آپ کی خدمات ایک سپاہی کی حیثیت سے منتقل ہو گئیں۔ چونکہ صداقت اور ایمانداری آپ کے رگ و پے میں سموئی ہوئی تھی اس لیے حوصلے میں مضبوطی اور ہمت میں بلندی آ گئی۔ آپ نے جس برائی کو بھی گریبان سے پکڑا سیدھا کر کے رکھ دیا۔

آپ نے اس ملازمت میں دو اصولوں پر باقاعدگی سے عمل کیا۔ ۱۔ رشوت سے نفرت اور ۲۔ ناجائز سفارش کی بیخ کنی۔

یہی وجہ تھی کہ برائی ان کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگی اور جرائم کی شہ رگ کٹنے لگی۔ پھر تو بابو جی کی ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ اور وہ بڑی جلدی تھانیداری کے منصب تک پہنچ گئے۔



آپ کی تقرری عموماً ان تھانوں میں کی جاتی جن کے حلقہ تفتیش میں جرائم زیادہ ہوتے تھے۔ جب آپ اپنے تھانے کا چارج لیتے تو بد معاش اپنی بد معاشیوں کو چھوڑ دیتے۔ چور چوریاں کرنے سے ہاتھ اٹھا لیتے۔ جواء کھیلنے والے جوئے کے سارے داؤ پیچ بھول جاتے اور شراب پینے والے اپنے شراب کے مٹکے اندیل دیتے۔ ان سب جرائم پیشہ لوگوں کو علم تھا کہ بابو خدا بخش کے قلم نے جو لکھ دیا وہ بھگتنا پڑے گا۔

آپ بطور ایس۔ ایچ۔ او تھانہ پٹی، سرہالی، کھالڑا، قصور، چوہنگ، ڈسکہ، مغل پورہ اور بطور انسپکٹر پنڈاون خاں، اور جہلم میں رہے۔

آپ کہا کرتے تھے کہ پولیس کا محکمہ بڑا اہم ہے۔ اگر یہی ملت کے دامن کے نیچے ادھیڑنا شروع کر دے تو لوگوں کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ بد معاشوں اور ڈاکوؤں کو کبھی معاف نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے لیے قانون جو سزا تجویز کرتا ہے وہ انہیں ملنی چاہیے۔ غالباً آپ کی تقرری ڈسکہ میں ہوئی تو ڈی۔ آئی۔ جی۔ پولیس کے دفتر کے ایک بابو نے کہا کہ بابو جی کچھ ہمارا بھی حصہ دیا کریں۔ یہ تھانہ تو ہزاروں میں بکا کرتا ہے۔ ہم نے آپ کی تقرری مفت میں کر دی ہے۔

بابو خدا بخش کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ کہا!

تم لوگ تھانوں کو بیچ کر غریبوں، مسکینوں اور شریفوں کی زندگی ان کی عزت، ان کا آرام اور سکون کا بھی سودا بد معاشوں کے ہاتھوں میں کر دیتے ہو۔ تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جب تھانے بک جائیں تو تھانے کا انچارج بد معاشوں کے ہاتھوں میں بک جاتا ہے۔ میں یہ سودا بازی نہیں کیا کرتا۔



یہ باجو آپ کے قدموں میں گر گیا حضور! میں نیا نیا آیا ہوں، مجھے آپ کے اصولوں کا علم نہیں تھا۔ خدا را کسی سے میری شکایت نہ کرنا، مارا جاؤں گا۔ بڑی مشکل سے نوکری ملی ہے۔

آپ ڈسکہ میں بطور ایس۔ ایچ۔ او کام کر رہے تھے، تو وہاں کے بد معاشوں نے دم ساڑھ لیا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ آپ چھٹی پر تھے، تو وہاں کے ایک امیر چوہدری شکر اللہ خاں (پاکستان کے سابقہ وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں کے بڑے بھائی) نے ایک غریب آدمی کو مارا۔ اتنا مارا کہ بیچارہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

شکر اللہ خاں نے مقتول کے وارثوں کو تھانے تک نہ جانے دیا۔ اس قتل کیس کی پولیس رپورٹ کی بھی نہ ضرورت محسوس کی اور نہ ہی پرواہ کی۔ بیچارے غریب لوگوں نے رو دھو کر اپنے مقتول کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا اور اس کی بخشش کی دعا کرنے لگے۔

باجو جب چھٹی گزار کر واپس آئے، تو آپ کو لوگوں کی زبانی پتہ چلا کہ بیچارہ بے گناہ تھا اور شکر اللہ خاں نے محض اپنی چودھراہٹ کی بنا پر اس کی جان کو ضائع کیا ہے۔

ایک غریب کی جان کا اٹلاف ایک امیر کے ہاتھوں! یہ ظلم کی انتہا ہے۔ کیا خدا بخش سے اس کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا؟ اگر خدا بخش نے اس ظلم کے ہاتھوں کو نہ توڑا تو قیامت کے دن اس قتل کی رو بکار خدا بخش کے کھاتے میں ہوگی۔

آپ نے اسی وقت صرف ایک سپاہی کو اپنے ساتھ لیا اور شکر اللہ خاں کے

ڈیرے میں چلے گئے۔ شکر اللہ خاں ڈیرے میں محفل جمائے بیٹھا تھا۔ حاشیہ برادر اس کی باتوں میں ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ اور وہ حقے کے ہر کش کے ساتھ مرغولے چھوڑ رہا تھا۔

شکر اللہ خان تعظیم کی خاطر اٹھا اور بابو جی کو کرسی پیش کی۔ عرض کی آؤ خان صاحب بیٹھیں۔

نہیں مجھے بیٹھنے کی ضرورت نہیں، مجھے آپ قتل کے کیس میں مطلوب ہیں۔ میں آپ کی گرفتاری کے لیے آیا ہوں۔

قتل! کون سا قتل! میرا قتل سے کیا تعلق ہے؟ میں تو ایک شریف شہری ہوں۔ ہر شخص کا خادم ہوں۔ آپ کا بھی اور شہر کے ہر امیر غریب کا بھی۔

میں نے آپ کا خادم ہونا دیکھ لیا ہے۔ پرسوں جس غریب کو آپ نے مارا ہے، اس کی روح کی ایک ایک آہ میں تمہارا نام شامل ہے۔

نہیں خان صاحب! میرا قتل سے کوئی تعلق نہیں تاہم تھانے جانے میں مجھے کوئی عذر نہیں۔ آپ جائیں میں آپ کے پیچھے پیچھے تھانہ آ رہا ہوں۔ رہا میرا قاتل ہونا، تو عدالت والے بتائیں گے کہ قاتل کون ہے؟ آپ کو ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے ایسی الزام تراشی زیب نہیں دیتی۔

میں تھانے میں آپ کی آمد کا انتظار نہیں کرنا چاہتا، آپ کو ابھی میرے ساتھ جانا ہے اور آہنی زنجیریں ہاتھوں میں پہن کر جانا ہے۔

یہ ہتھکڑیاں بد معاشوں کے زیور ہیں۔ یہ انہیں کو سجتے ہیں ہمارے دامن تو بس



عزت و شہرت کے پھولوں کے لیے ہیں۔

جیسے بھی ہے، میں بہر حال ہتھکڑی لگا کر ڈسکہ کے بازار میں سے گزار کر لے جاؤں گا تاکہ جن لوگوں کی زبان پر آپ کے جرم کی داستانیں ہیں انہیں لوگوں کی آنکھیں ایسے مجرم کو خدا بخش کی حراست میں بھی دیکھ سکیں۔

بابو خدا بخش آگے بڑھا اور اسے گرفتار کر لیا۔ زنجیر سپاہی کے ہاتھوں میں دی اور تھانے میں لے گیا۔ جلتے ہی حوالات میں بند کر دیا۔

کوئی دو تین گھنٹے کے بعد انگریز ڈی۔ سی (DC) اور ایس۔ پی (SP) کے خصوصی پیغام آئے شکر اللہ خان کو حوالات سے آزاد کر دیں۔ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ شریفوں کے ساتھ ایسا سلوک مزید مسائل پیدا کرتا ہے۔

آپ نے جواب میں عرض کیا۔ میری تفتیش کے مطابق شکر اللہ خان قاتل ہے۔ مقتول کی قبر کشائی ہو گی۔ میڈیکل رپورٹ حاصل کی جائے گی۔ عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ آگے ان کی قسمت عدالت جو فیصلہ کرے گی خدا بخش کے سر آنکھوں پر ہو گا۔ رہی بات حوالات سے شکر اللہ خان کو نکالنا میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ آپ خود اگر اس کی رہائی کے حق میں ہیں تو آجائیں، خود اپنے ہاتھوں سے اسے رہا کر دیں۔ انگریز ڈی۔ سی (DC) اور ایس۔ پی (SP) اس جواب پر بے بس ہو گئے۔ بابو جی نے شکر اللہ خان کا چالان کر دیا۔

بابو خدا بخش تھانہ چوہنگ میں جب آیا تو اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت دور دور تک پھیل رہی تھی۔ بابو خدا بخش نے ان کا نام سن رکھا تھا مگر



ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

تھانہ چوہنگ کی سرحد دریائے راوی کے دائیں کنارے کے کچھ دیہاتوں تک بھی تھی۔ بابو خدا بخش گشت پر تھا۔ اتفاق سے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ چوہنگ سے شرق پور شریف میں تشریف لا رہے تھے۔ انہوں نے کشتی پر سوار ہو کر دریا کو عبور کیا۔ اور رواں قدموں کے ساتھ چل دیئے۔ آپ نے کپڑے سے اپنے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

خدا بخش نے انہیں کوئی واردات یا خیال کیا۔ اس نے پیروی شروع کر دی۔ وہ جتنے تیز قدموں کے ساتھ چلتا۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سے بھی تیز چلتے۔ بابو خدا بخش نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس کے شک کا خیال یقین میں بدل گیا۔ اب اس نے آپ کے تعاقب میں بھاگنا شروع کر دیا۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بھاگنے لگے۔ رستے میں ایک قبرستان آیا ”غالبا“ ڈھانے کا قبرستان تھا“ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پرانی قبر دیکھی جو ایک گڑھے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ آپ جلدی سے اس قبر میں داخل ہو گئے اور اللہ کا ذکر کرنے لگے۔ بابو خدا بخش آیا۔ اس نے گلیائی (گردن کے پیچھے گریبان کا حصہ) سے پکڑا اور کھینچ کر باہر نکال لیا میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ گرتے گرتے بچے۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ وہ اپنے چہرے کو رومال سے چھپائے رکھتے تھے۔ بابو خدا بخش نے کوشش کی کہ ان کے چہرے سے رومال کھینچ دے اور ان کے چہرے کی پہچان کر کے معلوم کرے کہ وہ شخص کون ہے۔ میاں صاحب



رحمتہ اللہ علیہ بولے۔ اللہ کے بندے میں کوئی وارداتیا نہیں ہوں۔ آپ کی طرح اللہ کا ایک اونٹ سا بندہ ہوں۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ ایسا سلوک جیسا آپ نے میرے ساتھ کیا ہے، نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے بندوں کی عزت اور باطن کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ اور تنگ کرنے والوں کو وہ بھی تنگ کرتا ہے۔

مگر آپ ہیں کون؟ مجھے اپنا تعارف تو کروائیں۔

فقیروں کے تعارف کو آپ نے کیا کرنا ہے۔ مجھے لوگ شیر محمد کہتے ہیں لیکن میں اپنے آپ کو شیرو کہتا ہوں۔

یعنی شیر محمد عرف شیرو ہوئے نا آپ۔

بس میں ان دونوں ناموں کے سوا کچھ نہیں ہوں۔ خدا کو میری کوئی ادا پسند آجائے تو شیر محمد ہوں ورنہ شیرو ہوں۔

آپ کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جانا ہے؟

اللہ کی دنیا میں آیا ہوں۔ اللہ کی دنیا سے جانا ہے۔

اللہ کی دنیا تو بڑی وسیع ہے۔ ذرا اختصار سے نام لیں۔

شرق پور سے آیا تھا۔ شرق پور میں جا رہا ہوں۔

شرق پور!

ہاں ہاں شرق پور کل جب آپ آئیں گے، تو شرق پور شریف میں آپ مجھے دیکھ لیں گے۔

بابو خدا بخش کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ اس پوچھ کچھ میں کوئی جرم کر رہا ہے۔

اس کی گفتگو فرائض کی حدوں کو آگے تک پھلانگ رہی ہے۔ اور کوئی غیر مرئی قوت اسے مجبور کر رہی ہے کہ وہ مزید کوئی سوال اور تکرار نہ کرے۔ اور جتنی جلدی ہو سکے واپس چلا جائے۔

خدا بخش جو نہی گھر پہنچا اسے قونج کا درد ہونے لگا۔ اسے کسی کروٹ سکون نہ ملا وہ پہلو بدلتا رہا اور ہائے ہائے کرتا رہا۔ حکیم آئے۔ ڈاکٹر آئے دوا پر دوا دی گئی۔ مگر ہر دوائی سے تاثیر شاید سلب ہو چکی تھی۔ اسے آرام نہیں آتا تھا، آرام نہیں آیا۔ وہ الٹا ہو کے لیٹ جاتا، پھر اسے ایسے لگتا جیسے کوئی گلیائی سے پکڑ کر اسے کھینچ رہا ہے۔ وہ اٹھتا اپنے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارتا۔ کمرے کے کبھی اس کو نے میں دیوار سے ٹکر مارتا اور کبھی اس کو نے میں۔

تھانے کا سارا عملہ پریشان تھا کہ بابو کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ اسی طرح رات بیت گئی۔ طلوع فجر پر بابو جی نے کہا مجھے شرق پور شریف میں لے جاؤ۔ میری تکلیف کا علاج اس جگہ کے سوا کہیں نہیں ہے۔

دریائے راوی کے چوہنگ پتن تک ان کو گھوڑے پر بٹھا کر لایا گیا۔ کشتی کے ذریعے عبور کیا۔ پھر بیل گاڑی کا انتظام کیا گیا۔ جس جگہ کل میاں صاحب سے تکرار و مباحثہ ہوا تھا جو نہی اس جگہ کو پیچھے چھوڑا اور شرق پور شریف ہر لمحہ قریب ہوتا گیا تو بابو خدا بخش کے درد میں کمی ہوتی گئی۔ جب یہ لوگ ملکنہ گیٹ شرق پور شریف میں پہنچے تو بابو خدا بخش کا درد بالکل کافور ہو گیا یہ تھانیدار ایسے ہو گیا جیسے اس وقت سے چوبیس گھنٹے پہلے تھا۔ اب وہ خود پیدل چل کر اعلیٰ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ



کی خدمت میں حاضر ہوا۔

جاتے ہی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں گر پڑا اور رونا شروع کر دیا۔ حضور! مجھے معاف فرمادیں میری گستاخی کی سزا مجھے بڑی مل چکی ہے۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بھائی خدا بخش! تم نے کون سی گستاخی کی ہے؟ تم نے تو اپنا فرض پورا کیا ہے۔ آپ کا کام تو واقعاً ”چوروں کو، اچکوں کو، بد معاشوں کو“ اور ڈاکوؤں کو پکڑنا ہے۔ آپ کی نگاہ میں تو ہر شخص ہی مشکوک ہے۔ اس شک کی بنا پر آپ نے مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ تو یہ کوئی گستاخی تو نہیں ہے۔

نہیں حضرت صاحب میری آواز میں اور میرے طرز عمل میں شرافت نہیں تھی۔ بلکہ تھانیداری والا انداز تھا، جو آپ کی شایان شان نہیں تھا۔ چلو بھی آپ نے جو بھی انداز اپنایا ہم نے برداشت کر لیا۔

حضور میں بڑا نلوم ہوں۔ میں اس داغِ ندامت کو دھونا چاہتا ہوں۔ مجھے معاف فرمادیں۔ میاں صاحب نے بازوؤں سے پکڑ کر قریب کھینچ لیا اور سینے سے لگا لیا۔ فرمایا میرا سینہ آپ کے معاملے میں بالکل صاف ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔

سنو! حق کی حمایت میں کوشاں رہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کی راہ میں قدم قدم پر آسانیاں پیدا کرے گا۔

اب بابو خدا بخش ہر ہفتے عشرے کے بعد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ملنے کے لیے آتا اور فیوض و برکات سے جھولیاں بھر بھر کر لے جاتا۔



اعلیٰ حضرت میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ بے ریش شخص سے مصافحہ کرنا پسند نہ فرمایا کرتے تھے۔ مگر بابو خدا بخش ہی ایک ایسا شخص تھا جو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بعد باریش ہوا۔ تاہم میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے بے ریش ہونے پر بھی اس سے پیار سے ملتے تھے۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیض سے ہی اس کی زبان اور پھونک میں اللہ تعالیٰ نے فیض کی تاثیر رکھ دی تھی۔

جو کسی سے کہا پورا ہو گیا۔ ایک عورت آئی۔ ان کی بیوی سے ملی۔ روتے روتے عرض کرنے لگی۔ 12 سال سے گود خالی ہے۔ بے اولاد ہوں میاں اب دوسری شادی کرنے کے شوق میں ہے۔ بابو صاحب سے میری دعا کروائیں اللہ تعالیٰ مجھے بھی بیٹا عطا فرمادے۔

اتنے میں بابو جی آگئے۔ بیوی نے اس عورت کے لیے سفارش کی۔ پہلے تو نہیں مانے مگر جب اصرار برہا تو پانی پھونک کر دے دیا۔ تقریباً ایک سال بعد یہی عورت مٹھائی لے کر آئی۔ اس کی گود میں ایک ننھا منھا بچہ بھی تھا۔ بڑی خوش تھی۔ بابو جی نے اس بچے کے لئے دعا فرمائی کہ اللہ اسے نیک اور صلح بنائے۔

جب خود پور کا بھگا مگر سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوا تو تفتیش کا کام بابو خدا بخش کے سپرد ہوا۔ اس نے سکھوں کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔

ان سکھوں کے تعلق والے دوسرے سکھ 8000 روپے (جو آج کے حساب سے ساڑھے بیاسی لاکھ کے قریب بنتے ہیں) لیکر بابو خدا بخش کے پاس آئے۔ آپ نے ان لوگوں کو بھی حوالات میں بند کر دیا۔ اور انگریز ڈی۔ سی لاہور کو بلوا کر عرض کیا کہ قتل



کیس میں یہ لوگ مجھے یہ رقم پیش کر رہے ہیں، میں نے قطعاً اس میں سے ایک پیسہ تک نہیں لینا۔ آپ لینا چاہیں تو لے جائیں۔ ڈی۔ سی خدابخش کے اس کردار پر خوش ہو گیا۔ اس نے اسے شاباش دی۔

سکھوں کی مرضی جب پوری نہ ہوئی تو انہوں نے ڈی۔ آئی۔ جی پولیس اور گورنر پنجاب کو درخواستیں بھیج دیں کہ بابو خدابخش نے رشوت لے کر قتل کا جھوٹا مقدمہ بنا دیا ہے، گورنر کی طرف سے انکوائری ٹیم آئی تفتیش شروع ہوئی تو خدابخش نے عرض کیا۔ حضور! مجھ پر رشوت کا الزام ہے ممکن میرے خلاف جھوٹے گواہ بھی پیش ہو جائیں اور جھوٹ کی ایک تحریک مجھ پر رشوت کا جرم ثابت کر دے مگر میں عرض کروں گا کہ یہ میرا گھوڑا (عام روایات میں گھوڑی کا ذکر آتا ہے) بندھا ہوا ہے آپ اسے بغیر قیمت ادا کئے (چوری) چارہ لا کر کھلائیں۔ اگر اس نے وہ چارہ کھالیا تو میں نے یقیناً رشوت لی ہوگی اگر گھوڑے نے چارہ نہ کھالیا تو رشوت نہیں لی ہوگی۔

انکوائری آفیسر نے کہا۔ خدابخش! یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ گھوڑا تو ایک حیوان ہے اسے کیا تمیز ہے کہ چارہ چوری کا ہے یا قیمت ادا کی گئی ہے؟

آپ بجا فرماتے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ یہ گھوڑا چوری کا چارہ نہیں کھائے گا کیونکہ میں نے ہمیشہ طیب خوراک اسے دی ہے بلکہ یہاں تک کہ میں نے اسے کھیتوں کو دیا جانے والا پانی جو نالی میں چل رہا ہوتا بغیر اس کی قیمت دیئے نہیں پلایا۔

انکوائری آفیسر نے چوری کا چارہ منگوایا اور گھوڑے کے آگے ڈال دیا گھوڑے نے اسے سونگھا اور منہ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔



انکواری آفسر نے کہا یقیناً "آپ کا گھوڑا سیر شدہ ہے۔"

نہیں میرے آقا! گھوڑا بھوکا ہے۔ اب بابو خدا بخش نے اپنی گرہ سے پیسے دیئے۔ قیمتاً "چارہ منگوا لیا۔ جو نہی اسے گھوڑے کے آگے ڈالا گیا گھوڑے نے فوراً کھانا شروع کر دیا۔"

انکواری آفسر حیران رہ گیا۔ ایک حیوان میں حلال و حرام کی اس قدر تمیز اور صاحب تقویٰ کو حیوان کے بارے میں اتنا اعتماد و یقین وہ اس مشاہدہ پر جھوم جھوم کر دلو دینے لگا اس نے رپورٹ میں لکھا کہ خدا بخش کے خلاف درخواست حقیقت پر مبنی نہیں خدا بخش نے قطعاً "رشوت نہیں لی۔"

بابو خدا بخش انسپکٹر پولیس کے درجے تک پہنچے۔ 1936ء کو وہ چھٹی پر گھر آئے تو دنیا کی نوکری چھوڑ کر خدا کی نوکری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ نے ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی محکمہ نے بار بار واپس آنے کو کہا مگر آپ نہیں مانے۔

الوداعی پارٹی کی تقریب ہوئی تو ڈی۔ سی لاہور نے اپنی تقریر میں ایک سوال کیا کہ کیا کوئی شخص دریا میں چھلانگ لگا کر بالکل خشک حالت میں باہر نکل سکتا ہے۔

سب نے کہا نہیں ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

ڈی۔ سی نے کہا۔ نہیں بھائیو! ایسا ممکن بھی ہے آپ کے سامنے بابو خدا بخش کی ایک زندہ مثال موجود ہے اس نے پولیس میں رہ کر اپنے دامن کو رشوت کی آلودگی سے بچائے رکھا۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنے گھوڑے تک کو حرام چارہ نہیں ڈالتا تھا۔ اس کی کھرجی میں توڑی اور دانہ ہوتا تھا جہاں وہ رکا اس نے اسکی خوراک کھرجی میں سے نکال



کر دی اپنے لیے بھی روٹی اور اچار ساتھ رکھتا تھا۔

ہم نے سنا ہے ایک بار ایسا ہوا کہ اس نے کسی تندور والی کو پیسے دیئے کہ وہ اسے دو روٹیاں پکا دے تندور والی نے خیال کیا کہ بابو نیک افسر ہے اس کی خدمت سیوہ کرنی چاہیے چنانچہ اس نے گھی لگایا اور پراٹھے پکا کر دے دیئے اور ساتھ مرغ کا گوشت بھی بابو خدا بخش نے پوچھا۔ ماں جی! جو پیسے میں نے آپ کو دیئے تھے کیا ان سے ایسی روٹی اور سالن مل سکتا ہے؟۔

نہیں بیٹا! مگر خشک روٹی بھی سالن کے بغیر نہیں کھائی جاسکتی۔

بابو خدا بخش ناراض ہو گیا کہا کہ میں ایسی روٹی سے باز آیا۔ میں خشک روٹی پر نمک لگا کر کھالیا کرتا ہوں۔

اس نے وہ روٹی نہیں کھائی اور بھوکا چلا گیا۔

بابو خدا بخش ریٹائر ہوا تو اس نے اپنا گھوڑا اپنے ایک دوست علی حسین شاہ کو دے دیا، جو کہ پولیس میں ہی ملازم تھا اور منڈی کامونکی کے تھانے میں تھانیدار تھے۔ اور بابو خدا بخش کی طرح بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ مگر یہ گھوڑا انکے ہاں جا کر خوش نہیں ہوا۔ نہ چارا کھلایا۔ نہ پانی پیا۔ گھوڑا بیماروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہتا رہتا جیسے وہ رو رہا ہو۔ اور اپنے سابق مالک کی جدائی اس کی برداشت سے باہر ہو۔

ایک دن بابو خدا بخش اپنے دوست سے ملنے کو آیا۔ گھوڑے نے اپنے پرانے مالک کو دیکھا۔ پہلے ہنسنایا پھر بابو خدا بخش کے پاؤں پر اس نے سر رکھ دیا۔ آج پھر اس



گھوڑے کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

بابو خدا بخش کے اس دوست کا بیان ہے کہ وہ جب اس گھوڑے پر سوار ہوتا تو اس کے حوصلوں اور ہمتوں میں نئے دلولے پیدا ہو جاتے۔

بقول کرامت علی سب انسپکٹر پولیس 1988ء کی بات ہے کہ جب ہم بھرتی ہوئے تو سالہ میں زیر تربیت تھے۔ ہم ایک دن اپنے انسٹرکٹر کی عدم موجودگی کے باعث اپنی قسمت کو کوس رہے تھے کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز اس محکمے سے کر رہے ہیں جس کی پیشانی پر رشوت اور بد عنوانی کے بڑے بد نما داغ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اتنے میں ہمارے انسٹرکٹر جناب محمد صادق صاحب (جو اسوقت ڈسٹرکٹ پولیس لائن قلعہ گجر سنگھ میں بطور انسٹرکٹر تعینات ہیں) آ گئے۔ انہوں نے ہماری باتیں سن لیں۔ فرمایا۔

برخوردارو! یہ درست ہے کہ کچھ بد طینت لوگوں نے اس محکمہ کی ساکھ اور شہرت کو نقصان پہنچایا ہے، مگر اس کے ماضی کی داستانوں میں بابو خدا بخش جیسے کردار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ بادلوں کو اشارہ کر دیتے تو وہ برسنے لگتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق آپ کو بخشے۔ بابو خدا بخش نے 110 سال کی عمر پا کر 1981ء میں وفات پائی اور گنج مغل پورہ میں دفن ہوئے آپ نے اپنے پیچھے چار بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔ بڑے تینوں بیٹے چوہدری محمد نذیر خان۔ چوہدری عبدالحمید خان اور چوہدری احمد سعید خان۔ محکمہ پولیس میں اچھے عہدوں پر فائز رہے۔ جبکہ چوتھا بیٹا چوہدری فضل الرحمان خان وکیل ہے۔ صاحب اولاد ہیں اور صاحب عزت



بھی۔

چوہدری محمد نذیر خان اور چوہدری عبدالحمید خان اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔  
 بابو خدابخش ریٹائر ہونے کے بعد بڑھاپے کے باوجود شرق پور میں آستانہ عالیہ پر  
 حاضری دیتے رہے۔ گاہے گاہے چوہدری احمد سعید خان بھی ان کے ہمراہ ہوتے۔  
 نوٹ: اس مضمون کے مختلف واقعات کے راوی مندرجہ ذیل ہیں۔

- 1- چوہدری محمد علی شاہپور کائنجرہ حال لاہور۔
- 2- حاجی استاد محمد ابراہیم چوہنگ حال شرق پور شریف۔
- 3- حاجی باباجلال الدین چوہنگ۔
- 4- چوہدری احمد سعید خان ابن بابو خدابخش۔
- 5- چوہدری فضل الرحمان خان " " "۔
- 6- میاں چراغ دین ولد خوشی محمد پیپلز کالونی فیصل آباد۔
- 7- سید امجد علی شاہ منڈی کامونگی۔



## وامان فیض عام

- ☆ ولی کامل کی بات تقدیر بدل کے رکھ دیتی ہے۔
- ☆ سرکاری افسروں کی یاریاں جرائم کی رفتار میں اضافہ کرتی ہیں۔
- ☆ ہرنیاں (فتق) کی بیماری کے اسباب میں زنا ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔
- ☆ زنا بے پناہ جرائم کو جنم دیتا ہے۔
- ☆ شادی زنا سے بچاتی ہے۔
- ☆ بزرگان دین کے ہاں حاضری اخلاق کی تعمیر کرتی ہے اور ان کے دسترخوان کے ٹکڑے جسم کی بیماریوں کا علاج ہیں۔

اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کا 23 واں عرس مبارک بڑی دھوم دھام سے منایا جانے والا تھا۔ بغیر کسی اشتہار اور اعلان کے عرس کی تقریبات شروع ہونے سے قبل ہی لوگ شرقپور شریف میں آنا شروع ہو جاتے گلیاں اور بازار پر رونق بن جاتے تھے۔

زمین شرقپور شریف کی خاک کے ذروں میں ایک روحانی کشش تھی کہ زائرین دور دور سے پیدل چل کر آتے رہتے تھے اور ہر ایک ذکر و فکر میں مشغول رہتا۔ ان زائرین میں ایک بوڑھا بابا محمد ابراہیم جس کا تعلق قلعہ گوجر سنگھ لاہور سے تھا۔ اس



عرس کی تقریبات میں شمولیت کی غرض سے حاضر ہوا۔ کوئی 6 فٹ لمبا قد ہوگا۔ سفید واڑھی۔ موٹی موٹی آنکھیں مگر اندر دھنسی ہوئی۔ پر وجاہت چہرہ۔ سفید دھلے ہوئے کپڑے۔ سر پر گٹھڑی نما پگڑی باندھے ہاتھ میں لاٹھی لئے درمیانی چال سے چلتے ہوئے بولیاں والے کھوہ (کنواں) کی طرف بڑھتا ہوا آیا۔

بولیاں والا کھوہ شرقپور شریف کے جنوب مغرب میں واقع ہے اب کھوہ کا تقریباً "سارا رقبہ آبادی میں تبدیل ہو چکا ہے کھوہ کی حویلیاں اب بھی موجود ہیں مالکان کی اولادیں بڑھاپے کی حدوں میں داخل ہو چکی ہیں۔ انہیں مالکان میں ایک بابا حاجی غلام یسین ہے جس پر اعلیٰ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خاص نظر کرم تھی۔ عمر کی 85 ویں بہار دیکھ رہا ہے۔ اس کی یادداشت خاصی مضبوط ہے اور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات بڑی روانی کے ساتھ بیان کر جاتا ہے۔۔۔ ان کے بیان کی مطابقت جب حضرت قاری محمد ابراہیم (امام مسجد) نے غلام یسین کو حفظ قرآن کی خاطر میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت مانگی تو اعلیٰ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ بس اسے نمازی بنائیں۔۔۔ نمازی بنانے کی بات ایک ولی کامل کی زبان سے نکلی اور واقعاً "اسے نمازی بنا گئی۔ وہ بڑی خوشی سے اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ اب تک میری صرف ایک نماز (نماز عصر) قضاء ہوئی ہے اور پوری زندگی میں تین جمعے نہیں پڑھ سکا۔

یہ غلام یسین کھوہ پر ڈھور ڈنگروں کو چارہ ڈالنے میں مشغول تھا کہ اس نے اس باباجی کو دیکھا۔ باباجی یوں رواں قدموں کے ساتھ آرہے تھے جیسے اس کھوہ کے



سارے بندے ان سے واقف ہیں۔

رہٹ چل رہا تھا۔ سفید رنگ کے بیلوں کی جوڑی بڑے استقلال کے ساتھ پانی کھینچ رہی تھی۔ ان کے گلے کی گھنٹیوں اور گھنگرووں کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ باباجی آگے بڑھے۔ انہوں نے اپنے کپڑے اتارے ایک لنگوٹی زیب تن کی اور کپڑوں کو دھونا شروع کیا کپڑے دھوئے اور سوکھنے کے لیے دھوپ میں پھیلا دیئے۔ پھر خود نہاتے رہے۔ کنویں کے ٹھنڈے پانی میں نہاتے ہوئے انہیں ایک خاص لطف آرہا تھا بار بار کلیاں کرتے منہ دھوتے اور پھر پورے جسم کو پانی میں ڈبو دیتے۔ کلمہ پڑھتے ہوئے اپنے سر کے لمبے بالوں کو جو چہرے پر ڈھلک رہے تھے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پر بکھیر دیتے۔ انہوں نے کپڑے پہنے اور کھوہ کی چھوٹی سی کچی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی۔

نوجوان غلام یسین آگے بڑھا اور پوچھا۔ باباجی آپ کے کپڑے تو پہلے ہی دھلے ہوئے اور صاف ہیں اور ظاہر ہے کپڑے پہنتے وقت آپ نہائے بھی ضرور ہوں گے۔ مگر کپڑوں کو دوبارہ دھونا اور یوں پاکیزگی کی شرطوں کے ساتھ نہانے میں کیا مصلحت ہے؟

باباجی بولے بیٹا ہم بڑے گناہگار ہیں جو چیز بھی ہم سے لگ جاتی ہے نپاک ہو جاتی ہے۔ حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں شرکت کرنی ہے۔ اس لیے نپاک کپڑوں اور نپاک جسم کے ساتھ کیوں جائیں؟

باباجی کی ان باتوں میں بڑی مٹھاس تھی۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام لینے



میں بڑی عقیدت اور محبت ٹپکتی تھی اور نوجوان غلام یسین بھی اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ عرض کرنے لگا۔ باباجی مجھے کوئی خدمت کا موقعہ آپ دے سکتے ہیں حقہ تمباکو یا کوئی لسی پانی جس چیز کی طلب ہو فرمائیں۔ میں پیش کرنے کو تیار ہوں۔

باباجی آگے بڑھے انہوں نے نوجوان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا تم شرپور شریف میں رہ کر حقہ تمباکو کا نام لیتے ہو۔ تمہیں میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خوف نہیں ہے۔ تم لوگ تو بڑی قسمت والے ہو شرپور شریف جیسی بستی میں رہتے ہو اور پھر میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہمسائیگی تمہیں حاصل ہے۔

نوجوان باباجی کی ان باتوں سے بھیچ سا گیا۔ مگر دو سرے ہی لمحے باباجی نے فرمایا جاؤ لسی ہو تو لے آؤ۔ لسی میں نمک ڈال کے لانا۔۔۔ نوجوان نے باباجی کی خواہش کے مطابق یہ مشروب تیار کیا اور چھناں بھر کے دیا۔ باباجی لسی پیتے رہے اور دعائیں دیتے رہے فراغت کے بعد نوجوان نے باباجی سے عرض کیا۔ آپ عرس پر تشریف لاتے ہیں بڑی محبت اور عقیدت سے تشریف لاتے ہیں اس کے پس منظر میں اگر کوئی واقعہ ہو تو میں اسے سننا چاہتا ہوں۔

باباجی نے فرمایا نوجوان تم بڑے بھلے آدمی لگتے ہو۔ جو بزرگوں کے واقعات اس محبت سے سننا چاہتے ہو۔ میری زندگی کے واقعات بڑے گھناؤنے ہیں۔ ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو رو نگٹا رو نگٹا کانپنے لگتا ہے مگر انہیں واقعات میں ایک واقعہ ایسا بھی ہے جس نے میری زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے وہ انقلاب محض اعلیٰ حضرت



صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر عنایت سے آیا ہے۔

بیٹا تم بھی جوان ہو۔ نیک بخت ہو ہم پر بھی جوانی آئی۔ مگر بڑی خرمستیاں لے کر آئی۔ غلیظ شرارتوں سے لبریز ہو کر آئی۔ ساتوں عیبوں سے مزین ہو کر آئی۔ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ ہم عیبوں کے لیے پیدا ہوئے یا عیب صرف ہمارے لئے پیدا کئے گئے ہیں؟ اپنی زندگی کو جوا، شراب، زنا، چوری، قتل، اغوا اور ڈکیتی کو شباب سے ہمکنار کرنیوالے ہم ہی لوگ تھے قانون ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ ہم جیسے چاہتے ویسے ہی اس سے کام لیتے۔

نوجوان! ہم تین آدمی تھے۔ ایک لاہور کا ڈی۔ سی ایک فوج کا کرنل اور ایک میں میں چار مربعوں کا مالک تھا۔ حد نگاہ تک میری زمین ہی زمین تھی فصلیں پکتیں تو گودام غلے سے بھر جاتے اللہ تعالیٰ کی ان کرم بخششیوں کا مجھ سے شکر ادا نہ کیا جاسکا۔ رعونت آگئی۔ ڈی سی صاحب اور کرنل صاحب سے یاری لگ گئی میں ان کا مرہ بن گیا میرے جرائم پر پردہ ڈالنے میں وہ بڑے مفید ثابت ہوتے۔ لوگ تو کہتے ہیں چوہدریوں کے باعث جرائم کی رفتار بڑھتی ہے مگر میں کہتا ہوں سرکاری افسروں کی یاریاں جرائم میں اضافہ کرتی ہیں۔

ہمارے سارے جرائم صرف ایک جرم یعنی زنا کی خاطر تھے جو لڑکی ہمیں پسند آگئی اس کو حاصل کرنا ہمارا فرض بن جاتا اور اس کے حصول میں ہمیں جو بھی قیمت ادا کرنا پڑتی ہم اس سے گریز نہ کرتے جو ہماری راہ میں آتا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہماری اپنی ایک دنیا تھی اور ہم اس دنیا کے حاکم و مختار تھے۔ مگر یہ زیادتی اور ظلم جن لوگوں



کیساتھ ہوتا رہا ان کے خدا نے ہماری رسی بڑی ڈھیلی چھوڑے رکھی۔ ہم آگے ہی آگے بڑھتے گئے حقیقت میں ہم گرفت کے پھندے کے قریب جا رہے تھے۔ آخر وقت آگیا کرنل صاحب اور ڈی سی صاحب کی نوکری سے چھٹی ہو گئی۔ مجھ پر مقدمے بن گئے۔ جمع پونجی ہم سے روٹھ گئی۔ ناراض رہنے لگی۔ پولیس اور وکیلوں کے گھر کی جانب رخ کر لیا۔ جرماتوں کی سزائیں ہوئیں مگر سلاخوں ک پیچھے جانے سے بچ گئے۔ میری چاروں مربعے زمین رہن رکھی گئی اور مجھے ہرنیاں (فتق) ہو گئیں یہ تکلیف میری قوت برداشت سے باہر ہو گئی۔ لاہور کے حکیموں، ڈاکٹروں نے اپنے سارے نسخے آزما دیئے مگر آرام بالکل نہ آیا آخر پچاس ہزار 50000 روپے کی رقم لے کر دہلی میں علاج معالجے کی غرض سے گیا۔ رقم ختم ہو گئی مگر تکلیف کی گھڑیاں ختم نہ ہوئیں۔ سارا روپیہ برباد کر کے واپس آگیا۔

میرے دوستوں کرنل صاحب اور ڈی سی صاحب کو پتا چلا تو میری خبر گیری کو آئے مجھے سخت تکلیف تھی۔ میں کراہ رہا تھا۔ دوستوں کو دیکھا تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ان سے ملا تو دھاڑیں مار مار کر رویا دہلی کے قیام کی باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا ہم دینا والے سارے چور ہیں کوئی قوت بازو کے ذریعے لوگوں کو لوٹ رہا ہے اور کوئی عقل و فراست کی قوت سے لوٹ رہا ہے۔ ہم نے دوسرے لوگوں کو لوٹا پولیس وکیل اور ڈاکٹر حکیم ہمیں لوٹ رہے ہیں پچاس ہزار کی رقم ان ڈاکٹروں نے میری تجوری کی چابیاں مانگے بغیر مجھ سے لوٹ لی جب پیسے ختم ہو گئے تو گھر بھیج دیا کہ جاؤ اور پیسے لاؤ اب بھلا میں پیسے کہاں سے لاؤں۔



ایک لمحہ کے لئے خاموشی ہو گئی۔ تینوں دوست گہری سوچ میں ڈوب گئے کہ اچانک ڈی سی صاحب نے اس سکوت کو توڑا وہ کہنے لگے سنا ہے شرق پور شریف میں ایک ولی اللہ اعلیٰ حضرت میں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کی نگاہ اور زبان میں شفا ہے۔ چلو ان کے ہاں چلتے ہیں۔ ویسے بھی آج جمعہ ہے ملاقات کا زیادہ امکان ہے جمعہ شریف بھی ان کی اقتداء میں پڑھیں گے اور عرض حال بھی بیان کریں گے۔ کرنل صاحب نے کہا بھائیو! آپ کو علم ہے کہ میں کریلے اور قیمہ بڑے شوق سے کھاتا ہوں ہم نے آج یہ ڈش بڑے اہتمام سے گھر میں تیار کی ہے۔ چلو میرے گھر میں پہلے کھانا کھائیں ازاں بعد شرقپور شریف جائیں گے۔

اگر کھانا کھانے بیٹھ گئے تو دیر ہو جائے گی جمعہ بھی نہ پڑھ سکیں گے۔ باباجی نے بتایا۔ چنانچہ ہم تینوں دوست شرقپور شریف میں اعلیٰ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ کھانا آگیا فرمایا یہ کھانا کرنل صاحب کے لیے ہے اور آپ تھوڑی دیر تک انتظار کریں کرنل صاحب نے کھانا دیکھا تو کریلے اور قیمہ پکا ہوا تھا وہ حیران رہ گئے میاں صاحب نے فرمایا یہ آپ کا دلپسند کھانا ہے ناشوق سے کھائیں تھوڑی دیر کے بعد ہمارے لیے دال اور کدو کے ساتھ کھانا آیا۔ ہم نے بڑے شوق سے کھایا اتنے میں جمعہ کا وقت ہو گیا۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مسجد میں جائیں جمعہ کے بعد آپ سے باتیں ہوں گی۔ جمعہ پڑھنے کے بعد پھر میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شرف دیدار حاصل ہوا۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے پوچھا آپ کا نام کیا ہے۔



محمد ابراہیم۔ میں نے عرض کیا۔

آپ نے بڑے حیران ہو کر فرمایا دو پیغمبروں سے آپ کی نسبت ہے۔ مگر آپ نے کسی پیغمبر کی نسبت کا خیال نہ رکھا۔ رہی آپ کی ہرنیاں (فتق) کی تکلیف تو وہ کام ہی کیوں کرتے ہو جس سے ہرنیاں ہو جائیں۔ غالباً آپ کا اشارہ اس طرف تھا کہ زنا سے ہرنیاں ہو جاتی ہیں۔

مزید فرمایا گاھے گاھے ہماری دال چپاتی کھانے کو آجایا کرو۔ اللہ خیر کرے گا اور ہاں سنو تین شادیاں اور کر لینا زنا سے بچے رہو گے۔

اجازت ملنے پر ہم واپس چلے آئے۔ چند ہی دنوں کے بعد مجھے ہرنیاں سے نجات مل گئی۔ میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ سارے برے کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا نماز روزے سے لگاؤ ہو گیا۔ میری تو زندگی ہی بدل گئی۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق تین اور شادیاں بھی کیں ان تینوں بیویوں سے دو دو بچیاں پیدا ہوئیں میری پہلی بیوی سے دو بچیاں اور تین لڑکے تھے۔

چونکہ میری ساری زمین گروی رکھی ہوئی تھی کثرت اولاد سے میں کچھ پریشان رہتا تھا ایک دن حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور زمین کے واگذار کروانے کے لیے عرض کیا فرمایا گھبرائیے نہیں اللہ تعالیٰ کوئی بہتر سبیل پیدا کر دے گا۔ پھر ایک دن کیا ہوا میں مال روڈ کے پر رونق کنارے کنارے جا رہا تھا کہ سڑک کے عین بیچ میں ایک پرس پڑا ہوا دیکھا یہ پرس کس کا تھا؟ اس میں کیا تھا؟ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا میرے منہ میں پانی بھر آیا مگر اسے اٹھانے میں ڈرتا تھا۔ کہ کہیں دھرنہ لیا



جاؤں۔ میں ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور پرس کو دیکھتا رہا۔ بڑے لوگ آتے رہے اور گذرتے رہے بلکہ میں نے محسوس کیا کہ پرس پر کئی لوگوں کے قدم بھی آئے۔ مگر پرس کو کسی نے نہ اٹھایا گویا پرس کسی کو دکھائی ہی نہ دے رہا تھا اور صرف مجھے نظر آرہا تھا پورا ایک گھنٹہ گزر گیا کسی نے پرس نہ اٹھایا اب میں پرس اٹھانا چاہتا تھا مگر ہمت نہ ہوتی تھی میں اپنی بے ہمتی پر حیران تھا کہ پرس اٹھانے کی جرات مجھے کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ میں تو ایسے پرس لوگوں کے ہاتھوں سے چھین لیا کرتا تھا آج مجھے کیا ہو گیا ہے آخر میں نے دل مضبوط کیا رواں قدموں کے ساتھ آگے بڑھا اور یوں پرس اٹھالیا جیسے وہ میرا ہی ہو۔ میں جلدی سے سڑک کے کنارے پر آگیا زپ کھول کر ایک اچھتی نگاہ ڈالی تو اندر نوٹ ہی نوٹ تھے دل دھک دھک کرنے لگا ایک خوف سا طاری ہونے لگا دل نے چاہا اس پرس کو پھینک دوں مگر کیوں پھینکوں؟ مجھے تو خود کو روپوں کی ضرورت ہے میں کثیر العیال ہوں میری آمدنی سے اخراجات زیادہ ہیں یہ تو میرا خدا میری مدد کر رہا ہے میں اسے نہیں پھینکوں گامعا" خیال آیا اس قدر رقم کا مالک چین سے کب بیٹھے گا وہ تو بیچارہ مر ہی جائے گا۔ یقیناً" تھوڑی دیر کی بعد وہ روتا پیٹتا یہیں آئے گا۔ اگر اسے یہ رقم نہ ملی تو بیچارہ پاگل ہو جائے گا میں جبکہ اس رقم کا مالک نہیں ہوں تو اسے کیوں پاگل ہونے دوں اسے کیوں مرنے دوں۔ میں وہیں ٹہلنے لگا پرس کو چھپایا نہیں تاکہ ہر دیکھنے والے کو پرس دکھائی دیتا رہے ایک گھنٹہ دو گھنٹے تین گھنٹے گذر گئے شام ہونے کو آگئی ان روپوں کا مالک واپس نہ آیا آخر میں یہ پرس لے کر واپس گھر آ گیا۔



اپنے کمرے میں جا کر ان نوٹوں کو گنا تو پوری ایک لاکھ روپے کی رقم تھی میں نے اسے صندوق میں بند کر دیا اور تالہ لگا دیا رات کو کھانا بھی نہ کھایا سو گیا۔ مگر نیند نہیں آتی تھی بس کروٹیں بدل بدل کر رات گزاری صبح ہوئی نماز پڑھی اور تیار ہو کر شرچہ پور شریف میں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا چاہتا تھا کہ ان روپوں کا ذکر کروں تنہائی چاہتا تھا مگر تنہائی نہ مل سکی لوگ آتے رہے اور رونق ہوتی رہی میری ہمت جواب دے گئی مری جرات مفلوج ہو گئی نہ پوچھ سکا کہ اثنائے گفتگو حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بعض اوقات کافر کا گرا ہوا مال ضرور تمند پر حلال ہو جاتا ہے ہاں ہاں اسے اپنے مصرف میں لے آنا چاہئے کوئی مضائقہ نہیں اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنے بندوں کی یوں مدد فرمادیتا ہے۔

میں روپوں کا ذکر کئے بغیر اجازت ملنے پر واپس آگیا ساہوکار کو یہ رقم دی اور اپنا ایک مربع زمین واگزار کروالی قبضہ لے لیا اور کاشت کرنے لگا فصل گھر میں آنے لگی گھر کی حالت سدھرنے لگی حالات بہتر سے بہتر ہونے لگے باقی تین مربع تین لاکھ میں سکھوں کے پاس رہن تھی تین لاکھ نہ جمع ہوئے نہ زمین واپس لی۔

ایک دن حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا آپ نے فرمایا ابراہیم تم اپنی زمین بیچ نہ دینا اور نہ ہی انتقال سکھوں کے نام کروانا اللہ کوئی بہتر سبب فرمادے گا۔

زمین سکھوں کے پاس رہی اور میرے اخراجات ایک مربع کی کاشت کاری سے پورے ہوتے رہے آخر ایک دن ایسا آیا کہ ہم حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سایہ



سے محروم ہو گئے حضور کا وصال ہو گیا شرقپور شریف کے درودیوار رونے لگے کوئی کسی کو چپ کروانے والا نہ تھا ایک دنیا دھاڑیں مارتی ہوئی شرقپور شریف کی طرف بڑھ رہی تھی آخر کیا ہوا حضور کا جسد خاکی ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے زمین کے حوالے کر دیا آپ کی محبتیں اور شفقتیں ساری زمین کے نیچے دفن کر دیں۔

میرے حالات میں نشیب و فراز آتے رہے بچوں اور بچیوں کی شادیوں کے باعث کئی بار زیر بار ہوا زمین بیچنے تک نوبت آجاتی مگر حضور کا ارشاد یاد آجاتا کہ زمین کو بیچنا نہیں۔

آخر 1947ء کے ہنگامے شروع ہو گئے پاکستان بن گیا ہندو اور سکھ ہندوستان میں جانے لگے میرے پاس اس وقت 30 ہزار کی رقم تھی میں یہ رقم لے کر سکھوں کے پاس گیا عرض کیا سردار جی آپ تو جارہے ہیں زمین تم یہیں چھوڑ جاؤ گے بہتر ہے میں آپ کو دس ہزار روپے فی مربع کی حساب سے رقم دیدوں اور آپ میری زمین کے کاغذات واپس کر دیں۔

سردار جی نے کہا واہ بھئی واہ تین لاکھ کے بدلے میں صرف تیس ہزار لے لوں۔۔۔ اچھائیوں کرو بیس ہزار کے حساب سے رقم دے دو کل ساٹھ ہزار روپے بنتے ہیں میں نے کہا نہیں سردار جی میرے پاس تو بس یہی تیس ہزار ہیں میں نے رقم ان کے آگے ڈھیر کر دی۔

میں خوشی خوشی گھر واپس آ گیا میں اپنے چاروں مربع زمین کا مالک دوبارہ بن گیا تھا قلعہ گوجر سنگھ کا رئیس بن چکا تھا اس دن حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا



مطلب مجھ پر واضح ہو گیا جو آپ نے تیس اکتیس سال قبل فرمایا تھا کہ زمین کو نہ بیچنا نہ انتقال کر کے دینا۔

آستانہ شرقپور شریف پر آکر میری کایا پٹی میری زندگی میں انقلاب آیا میں برا تھا نیک بن گیا بد حال تھا خوشحال بن گیا بیمار تھا صحت یاب ہو گیا زمین کا مالک نہ تھا مالک دوبارہ بن گیا۔

جو بات ظہر کی نماز کے بعد شروع ہوئی تھی وہ عصر کی نماز کے وقت کی حدوں میں داخل ہو گئی اور بابا دربار اقدس کی جانب چل دیا۔

حسب روایت حاجی غلام یسین (حیات ہے) بولا شرقپور شریف

ماہ نامہ نور اسلام، جون 1993ء



## تکمیل آرزو

- ☆ ولی کامل کی نگاہوں کے سامنے فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔
- ☆ مرد حق کا فکر رب العزت کی باگاہ کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔
- ☆ اللہ تعالیٰ اپنی خبروں کے ذریعے ناہیدہ واقعات کی اطلاع اپنے بندوں کو دے دیتا ہے۔
- ☆ اللہ کے بندے بغیر اللہ کے اذن کے خاموش رہتے ہیں۔

غالباً" یہ 1956 کی بات ہے کہ میری والدہ کو اچانک دل کا دورہ پڑا۔ ہم سب پریشان ہو گئے۔ حاجی فضل الہی مونگہ صاحب اور میرے والد محترم کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو ایک رقعہ دیا کہ وہ مریضہ کو ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کے پاس لے جائیں۔ وہ دل کے امراض کے مخصوص ڈاکٹر ہیں۔ چنانچہ والدہ صاحبہ کو لاہور لے جانے میں مجھے بھی والد صاحب کے ساتھ جانا پڑا۔ مرقومہ پتہ کے مطابق ہم ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ برآمدہ میں مریضوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ ہم سب سے آخر میں کھڑے ہو گئے۔ اور حاجی صاحب والا رقعہ ڈاکٹر صاحب تک پہنچا دیا گیا۔

ہمارا خیال تھا کہ کوئی دو گھنٹے کے بعد ہماری باری آئے گی۔ مگر ہمارا یہ خیال غلط



ثابت ہوا۔ جونہی رقعہ ڈاکٹر صاحب کو ملا وہ فوراً "ننگے پاؤں باہر آگئے۔ سارے مریضوں کو روک کر ہمیں اندر لے گئے۔ والدہ صاحبہ کا چیک اپ بذریعہ آلات کیا۔ کچھ دوائیاں لکھ کر دیں۔ والد صاحب نے فیس کا پوچھا تو کہنے لگے کہ شرمندہ نہ کریں۔ میں تو شرقپور شریف کے کتوں کا بھی نوکر ہوں۔ بس حضرت (حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرقپوری) کے روضہ اقدس پر میرا سلام عرض کر دینا۔

ہم واپس آگئے۔ میری عمر اس وقت کچھ زیادہ نہ تھی۔ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے اس تعلق خاص اور عقیدت کو نہ سمجھ سکا۔ اور حیران تھا۔ کہ اتنا بڑا ڈاکٹر جو میو ہسپتال کا انچارج رہ چکا ہو۔ وقت کے بڑے بڑے امراء اس کے زیر علاج رہے ہوں اور اب بھی پورے پاکستان والے اس کے نام اور کام سے واقف ہوں۔ اس قدر عظیم شخص اور شرقپور شریف کی خاک کے ذروں کا اتنا احترام۔ یقیناً "شرقپوری سرکار (حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ) کا فیض یافتہ ہوگا۔ جستجو رہی کہ ڈاکٹر صاحب کے اس تعلق خاص اور حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عطا کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے۔

جب میں قلم پکڑنے اور سنبھالنے کے لائق ہوا اس وقت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کو جاننے والے اکثر باری باری سفر آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔

جناب حاجی فضل الہی صاحب مونگہ مرحوم کی روایت۔ نور اسلام شیر ربانی نمبر جون۔ جولائی 1969ء کی تحریریں اور اب حضرت صاحبزادہ میاں جلیل احمد صاحب کی روایت کی روشنی میں اس مضمون کو ترتیب دے رہا ہوں۔



ڈاکٹر محمد یوسف صاحب مرحوم 1915ء میں کیمبل پور میں تعینات تھے۔ جوہر قابل تھے عوام اور خواص میں پہچانے جانے لگے۔ ڈاکٹر ہونے کے باوجود روحانیت کے قائل تھے۔ اللہ والوں کی باتیں شوق سے سنتے اور محبت سے سنایا کرتے تھے۔ اور فرصت کے لمحات میں قریب کے مزاروں پر حاضری بھی دیا کرتے تھے اور روحانی فیض پاتے تھے۔

گلشن شرقپور شریف میں بہار آئی تو اس کے گل نوبہار کی لپٹیں دور دور تک جانے لگیں۔ مشام جان نکلتا تازہ سے محظوظ ہونے لگی۔ ڈاکٹر محمد یوسف بھی اس نکلت چمن سے لطف اندوز ہوئے تو راحت جان نے قربت اور وصل کا تقاضا کیا۔ بے قرار یوں نے جنم لیا۔ اضطراب نے کباب سیخ بنا دیا۔ نیدیں بے خوابی کی سیج پر بے آرام ہونے لگیں۔

لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ آپ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں کے ڈورے بھی قدرے سرخ ہیں اور ناسازی طبع کا اظہار جسم کے انگ انگ سے ہوتا ہے“ ڈاکٹر صاحب ہر پوچھنے والے سے یہی کہتے کہ پتہ نہیں بس ایک نادیدہ شوق نے بے قرار کر رکھا ہے۔ جس کو دیکھا نہیں ہے وہ مختلف روپ میں آنکھوں میں بسا جا رہا ہے۔ چاہتا ہوں کہ پر لگ جائیں اور شرقپور شریف میں چلا جاؤں۔ مگر ہائے یہ سرکاری نوکری کتنی ظالمانہ ذمہ داری کے ساتھ شوق وصل میں حائل ہے۔

آخر ایک دن ڈاکٹر صاحب نے شرقپور شریف میں حضرت صاحب رحمۃ اللہ



علیہ قبلہ کی خدمت میں کچھ اس مضمون کا خط لکھا۔

حضرت صاحب! بہت دور ہوں۔ کرم فرمائیں اور اپنی قربت میں لاہور میں بلوا

لیں۔ دید اور شنید کے فاصلے مٹ جائیں گے اور وصل وجہ سکون بنے گا۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا:

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر

آرے شود ولیک بخون جگر شود

(یعنی) کہتے ہیں کہ پتھر بھی مقام صبر میں (صبر کر کے) ہیرا بن جاتا ہے۔ ہاں

ایسا ممکن ہے کہ خون جگر سے بھی ہیرا بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا تھا۔ کوئی جان

پہچان نہ تھی۔ بے قرار دل نے خط لکھوا دیا تھا۔ جواب کی امید نہ تھی۔ مگر جب

جواب آیا تو مایہ بے آب کی بیتابی نے سکون پکڑا۔ چوما اور بار بار چوما۔ آنکھوں

سے لگایا اور حرز جان بنانے کو جی چاہا۔ مگر خط میں اظہار شوق کی ممانعت اور صبر و

تکلیب کی ہدایت تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے روئیں روئیں کو ہدایت کی کہ اضطراب کے خیر مقدم میں

کہیں روٹنے نہ بن جائے۔ آنکھیں اپنا غبار چشم دھونے کو بھی دل سے پانی نہ مانگیں

اور جان و دل کسی بھی بے تلی کا اظہار نہ کریں۔ محبت اور عقیدت کے اس

بندے کے ایک ایک عضو نے سر تسلیم خم کر دیا اور یوں سات سال کا عرصہ گزر

گیا۔

میاں صاحب برابر اس محبت کے پیکر کی کیفیات کا مطالعہ فرماتے رہے۔ جب صبر و شکیب میں پختہ پایا تو بلوا لیا۔ اپنے قرب میں لاہور کے میو ہسپتال میں ہاؤس فزیشن کی آسامی پر۔ لاہور شرقپور شریف سے صرف بیس میل کے فاصلے پر اب نظارہ دید میں کوئی دقت نہیں۔ سوز دل کو چھینٹا دینے میں آسانی ہے اور مطالعہ دل کی تدریس میں سہولت۔

انہی دنوں اس ہسپتال میں 6 نئی آسامیاں کلینیکل اسٹنٹ کی منظور ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش نے ایک اور انگڑائی لی کہ اگر ان میں سے ایک پر ان کی تعیناتی ہو جائے تو ان کی ملازمت بام عروج کو چھو سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اور پھر دوزانو ہو کر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ کئی اور لوگ بھی سرنگوں ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے اختصار کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی باری آئی تو سکوت نے لفظوں کا دامن پکڑ لیا۔ اب مانع ہوا۔ زبان کے فرش پر ایک لفظ بھی محور قص نہ ہو سکا۔ حضرت صاحب نے خود ہی پوچھا۔ ”ڈاکٹر جی! اب تو خوش ہونا! لاہور میں آپ کی خواہش پوری ہو گئی“

”جی الحمد للہ بہت خوش ہوں۔ مگر دل ایک اور لالچ کے جال میں پھنس گیا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

حضرت صاحب نے تبسم فرمایا ”وہ کیسے؟ اب کس لالچ میں گرفتار ہو۔“



”میو ہسپتال میں چھ نئی آسامیاں کلینیکل اسٹنٹ کی منظور ہوئی

ہیں۔ ایک پر میں اپنا تقرر چاہتا ہوں۔“

”ہاں! میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ کی تعیناتی اس آسامی پر ہو جائے۔ لیکن اللہ

کی مرضی....“ لفظ ”لیکن“ اللہ کی مرضی کو ”نہی“ تک لے گیا۔

ڈاکٹر صاحب گھبرا سے گئے۔ وہ بڑے پر امید تھے کہ حضرت صاحب امید افزا

جواب دیں گے۔ کیونکہ ظاہری حالات پر ڈاکٹر صاحب کی گرفت تھی۔ مگر حضرت

صاحب کے اس جواب سے یہ گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ دبی زبان سے عرض کیا۔ ”

حضور! اللہ کی مرضی معلوم نہیں ہوتی، سے کیا مراد ہے؟“۔ آپ نے فرمایا۔ ”اچھا

آہستہ آہستہ ہو جائے گا۔“

گورنمنٹ نے بذریعہ اخبار اشتہار دے کر ان آسامیوں کی تشہیر کی اور

درخواستیں مانگیں۔ ابھی درخواستوں کی آخری تاریخ باقی تھی کہ گورنمنٹ نے

فیصلہ کیا کہ چونکہ بجٹ میں پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے ان آسامیوں کو فی الحال پر نہ

کیا جائے۔ اس طرح دو سال تک ان کی باری میں کوئی فیصلہ نہ کیا جاسکا۔ لہذا

1924ء میں چھ کی بجائے صرف تین آسامیوں کی منظوری ہوئی اور درخواستیں

طلب کی گئیں۔

تعلیمی استعداد کی شرط تو ڈاکٹر صاحب پوری کرتے تھے مگر کچھ ڈاکٹر اس شرط

کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محمد یوسف سے سینئر بھی تھے۔ اس لیے ڈاکٹر

یوسف کے لیے ان تینوں آسامیوں میں سے ایک پر بھی تعینات ہونا امر محال تھا۔

درخواستیں اس قدر زیادہ تھیں کہ اکثر سینئر ڈاکٹروں کی راہ میں بعض کی تعلیمی استعداد غالب آسکتی تھی۔ ایسے درخواست دینے والے ڈاکٹروں نے کوشش کی کہ وہ ولایت جا کر مزید کوئی ڈگری حاصل کریں تاکہ کامیابی کے امکانات زیادہ واضح ہو سکیں۔ ڈاکٹر یوسف بھی ولایت جانے والوں میں سے ایک تھے۔ مگر ولایت جانے سے قبل انہوں نے حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت نہ لی۔ وہ اپنی کم فہمی کی بنا پر یہ خیال کر بیٹھے کہ اگر حضور نے ان کو ولایت میں جانا ناپسند فرمایا تو پھر جانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے قدم بوسی کے بغیر ہی ڈاکٹر صاحب اکتوبر 1924ء میں ولایت چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کو داخلہ مل گیا اور پڑھائی شروع ہو گئی۔ ڈیڑھ مہینہ گزرنے کے بعد حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ڈاکٹر صاحب نے خط لکھا۔ جس میں ولایت تک جانے، داخلہ پڑھائی اور لندن کے معاشرتی حالات قلم بند کئے۔

یہ خط جونہی حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شرقپور شریف میں ملا آپ رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا۔ خوش ہوئے اور اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا۔ جس کا عکس اگلے صفحے پر ہے۔





سپاہ پرستہ و شہسوار  
خوار و خوار و خوار

اشفاق

اللہ اکبر  
اللہ اکبر

حالا ملک غلام  
اللہ اکبر  
اللہ اکبر

اللہ اکبر بنار و توتہ  
اللہ اکبر بنار و توتہ

نعمتیں باگر در زہیں عالم بندہ

خردہ لائزہ خیال پیر سکرے اپنی

کام سمانی لکھ کر اور مال

پاہ مانگی و مال اکبر میں خلاف شریعت

بجا و اصرار میں کر کے لایا ہی بہر قوف

بائیں بنائی نہیں پائی = اللہ میدان پر

انشاء اللہ کے پیر ایسے

ارخصہ و (خلاف با و الام)

نیکینتر - میان کو بر صفت حکم کر لیتے ہیں  
کافکا دیکھا - کافکا زیادہ کر صفت  
اللہ اکبر بنار و توتہ  
نعمتیں باگر در زہیں عالم بندہ  
خردہ لائزہ خیال پیر سکرے اپنی  
کام سمانی لکھ کر اور مال  
پاہ مانگی و مال اکبر میں خلاف شریعت  
بجا و اصرار میں کر کے لایا ہی بہر قوف  
بائیں بنائی نہیں پائی = اللہ میدان پر  
انشاء اللہ کے پیر ایسے  
ارخصہ و (خلاف با و الام)

اللہ اکبر بنار و توتہ  
اللہ اکبر بنار و توتہ  
اللہ اکبر بنار و توتہ

ڈاکٹر صاحب اس خط کو صحیفہ کا نام دیتے ہیں۔ اس خط کو انہوں نے مرتے دم تک حرز جان بنائے رکھا۔ جب ان کا آخری وقت آیا تو آپ نے اپنے بچوں سے کہا کہ وہ اس خط کو ان کے کفن میں رکھ دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے اندازے کے مطابق جب ان کا خط شرقپور شریف میں پہنچا۔ اسی دن سے ان کی بے چینی اور بے قراری میں اضافہ ہونے لگا۔ کتابیں چھوٹ گئیں۔ پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا۔ بس یہی دل چاہتا کہ لندن کو چھوڑ کر واپس چلا جاؤں۔ اور حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں پر سر رکھ کر گڑگڑاؤں۔ آخر ایک دن یہ حالت ہوئی کہ پیدل چل نکلے اور چالیس میل تک چلتے گئے۔ بوٹوں میں سوراخ ہو گئے۔ دسمبر کی سردی ہلکی ہلکی بارش مسلسل ہوتی رہی۔ مگر کوئی رکاوٹ بھی سد راہ نہ بنی۔ نامعلوم منزل کی جانب چلتے گئے۔ دوستوں کو ان کی فکر دامن گیر ہوئی۔ کئی دنوں کے بعد ڈھونڈ کر لائے۔ کہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خط انہیں ملا۔ اسے پڑھا اور مزید بے قرار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب امتحان کا داخلہ جمع کروا چکے تھے۔ صرف نو دن کے بعد امتحان شروع ہونے والا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے یہ امتحان نہیں دیا۔ صرف سمسٹروں کے امتحان دیئے تھے۔ واپس آنے کا ارادہ کیا اور جہاز میں بیٹھ کر لاہور میں آ گئے۔ ایک دن گھر میں ٹھہرنے کے بعد شرقپور شریف میں حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔

حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر صاحب سے حیران ہو کر پوچھا۔ ”



ارے آپ! اتنی جلدی کیسے اور کیوں واپس آگئے؟“

”حضور! تعمیل ارشاد کی خاطر۔“

حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر صاحب کا آناپسند نہیں فرمایا۔ ویسے بھی آپ کی طبیعت اس دن کچھ علیل تھی۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ اس وجہ سے بھی کچھ مصروفیت تھی۔ فرمایا۔ ”اچھا! کل آپ سے ملیں گے۔“

حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ رات بھر یہ فکر کرتے رہے کہ بیچارے کا خواہ مخواہ مالی نقصان ہوا ہے۔ یہ فکر ایک ولی کا فکر تھا۔ یہ فکر رب رحیم کی بارگاہ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ ولی کی یہ دستک مقبول بارگاہ ہوئی۔

دوسری صبح حضور رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر صاحب کو طلب فرمایا اور پوچھا ”اب تمہارا کیا ہو گا؟“ اس وقت آپ رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر کچھ فکر مندی کے اثرات تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”حضور! میرا بگڑا ہی کیا ہے۔ کچھ روپیہ اپنے پاس تھا وہ خرچ ہو گیا۔ اور بس۔ اپنی ملازمت پر واپس آگیا ہوں۔ اور وہ کیا ہے جو میرے امتحان کے پاس کرنے پر ملے مگر آپ کی دعا سے نہ ملے۔“

اس نیازمندانہ عرض میں کوئی تصنع نہ تھا۔ بات دل کی گہرائی سے نکلی تھی۔ حضور خوش ہو گئے۔ فرمانے لگے۔ ”چاہتے کیا ہو؟“

ڈاکٹر صاحب نے عرض کیا۔ ”لاہور میں ہی میرا کام بن جائے۔“

حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اپنے عالی مقام کا اخفاء فرماتے تھے۔

لیکن اس دفعہ آپ کو نہایت جمال اور جلال کی حالت میں دیکھا گیا۔ فوراً فرمانے لگے:

”میں نے سمجھا تھا کوئی بڑا کام خراب ہو گیا ہے۔ تم نے مجھے تسلی دی ہے۔ اچھا! لاہور میں یہی کام بن جائے گا۔ اور وہ لندن والا کام بھی یہیں بن جائے گا۔ فی الحال واجبی سہی آہستہ آہستہ اچھا بن جائے گا۔ بس کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ پر میاں یوسف تیرے نال ہوئی ڈاڈی ستھری اے!“

اس پر ڈاکٹر صاحب نے عرض کیا۔ ”حضور میں اسی قابل تھا۔“

آپ نے فرمایا ”یہ نہ کہو۔۔۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ وہاں تیری نمازوں کا کیا حال تھا۔ اور کھانے میں حرام و حلال کا کیا حال تھا؟“

ڈاکٹر صاحب نے شرم کے مارے سر کو جھکا لیا۔

مزید فرمانے لگے ”اگر انگریزوں نے تار خبریں لگا رکھی ہیں تو اللہ نے بھی تار خبریں لگا رکھی ہیں۔ میں نے تو یہ نہیں کہا تھا کہ واپس آجاؤ۔ وہیں آپ نماز بھی پڑھتے، درود شریف پڑھتے اور خوب اللہ اللہ کرتے۔“

شرقیہ شریف سے اجازت لے کر ڈاکٹر صاحب لاہور گئے تو انہیں ہسپتال میں پہلی آسامی سے بہتر آسامی مل گئی۔ اس کے بعد وہ آسامی بھی مل گئی جو انہیں لندن کا امتحان پاس کرنے پر ملنی تھی۔ اس آسامی کے لئے تین سو امیدوار تھے۔ پورے ہندوستان سے اور دیگر ممالک سے بھی درخواستیں آئی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تعیناتی کے بعد ان کے خلاف مقدمہ درج کر دیا گیا کہ



انہیں غیر قانونی طور پر تعینات کیا گیا ہے۔ اس وقت وزیر صحت سر لالہ چھوٹو رام تھے۔ انسپکٹر جنرل ماکھلے مرہٹہ تھے اور انتخاب کرنے والے پروفیسر تو ویسے ہی ان کے خلاف تھے۔

عدالت میں پیشیاں ہوتی رہیں۔ مگر جس دن ڈاکٹر صاحب کو اپنے استحقاق کے ثبوت میں کلغذات پیش کرنے تھے۔ اس سے ایک دن پیشتر لندن سے ڈگری بذریعہ رجسٹری انہیں مل گئی۔ جس نے ڈاکٹر صاحب کے موقف کو بڑا مضبوط کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے لندن میں امتحان نہیں دیا۔ یہ ڈگری حاصل کرنے کا انہیں حق نہیں تھا۔ مگر یہ میاں صاحب کی کرامت تھی کہ ان کے سمسٹروں کے اچھے نتائج کی روشنی میں انہیں پورے امتحان میں کامیاب کر دیا گیا اور یہ ڈگری بھیجی۔ اس خوشی کا خط حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لکھا گیا۔ جواب میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”اس پر قناعت نہ کرو۔ ابھی تو آپ نے اس سے بڑے اعزاز کو حاصل کرنا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب حیران تھے کہ اس سے بھی بڑا اعزاز کون سا ہے۔ آخر ایک دن آیا جبکہ ڈاکٹر صاحب سارے میو ہسپتال کے انچارج بنا دیئے گئے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا  
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایک دن حضرت صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے مکان کے بارے میں دریافت فرمایا کہ کیا مکان تمہارا اپنا ہے۔ یا کرائے کے مکان میں رہتے ہو؟ ڈاکٹر صاحب نے عرض کیا ”اپنا مکان نہیں ہے۔“

آپ نے فرمایا ”کوئی فکر نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ مکان بھی دے گا۔“

چنانچہ 1939ء میں ڈاکٹر صاحب نے اپنا ذاتی مکان برداشان دار بنایا اور اس

پر لکھوایا:

فنائی الحق میاں شیر محمد  
 بہ عاصی لطف ے فرمود بے حد  
 ہم این کاشانہ آیہ یمن دعائش  
 شدہ تعمیر و تاریخ بنائش  
 بے دل پذیرے دل نشین است  
 زہے فردوس بر روئے زمین است

1358ھ

1939ء

یعنی میاں شیر محمد رحمۃ اللہ علیہ جو فنائی الحق تھے مجھ گناہ گار پر بے حد مہربانی فرماتے تھے۔ یہ جھونپڑا بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ کی دعا برکت سے تعمیر ہوا ہے۔ اور اسکی تاریخ بڑی دل پذیر اور دل نشین ہے جو یہ ہے ”زہے فردوس بر روئے زمین است اس مادہ تاریخ سے 1358ھ برآمد ہوتا ہے“ یعنی زمین پر کتنی پیاری جنت ہے۔



حوالہ کے لیے نور اسلام شیرربانی نمبر جون۔ جولائی 1969ء

راویان: (1) حاجی فضل الہی مونگہ صاحب (مرحوم) (2) صاحبزادہ حضرت میاں

جلیل احمد صاحب ابن حضرت صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب مدظلہ العالی

ماہنامہ نور اسلام اکتوبر 1992ء



## دور بین

- ☆ اہل ایمان بزرگان دین سے تعلق قائم رکھتے ہیں۔
- ☆ ولی اللہ کی نگاہیں ہزاروں میل کی مسافت تک دیکھ لیتی ہیں۔
- ☆ مرد کامل وہی بات کرتا ہی جس کا ہونا یقینی ہو۔
- ☆ عورت کے حسن سے سرشار ہو کر مسلمان ہونے والے انگریز کے ایمان میں پختگی
- ایک ولی اللہ کی بارگاہ میں ہوئی۔

انگریزی دور میں لاہور میں کامیابی اور شہرت کے ساتھ جو ہوٹل چل رہے تھے ان میں ایک ہوٹل نیڈو ہوٹل بھی تھا۔ جو لاہور اور ہندوستان میں ہی نہیں پورے عالم میں متعارف تھا۔ دنیا کے کسی خطے سے اگر کوئی شخص لاہور میں آتا تو کمرے کی ریزرویشن اسی ہوٹل میں کروانے کی کوشش کرتا۔ لاہور والے اس ہوٹل کو نیڈو صاحب کہتے تھے۔ اس ہوٹل کے انگریز مالک کا نام ”ہینری نیڈو“ تھا۔ اس ہوٹل کا علاوہ اس کا ایک اور ہوٹل اسی نام سے سری لنکا میں بھی تھا۔

ہینری نیڈو چونکہ ایک امیر کبیر آدمی تھا وہ آرام و زندگی گزارنا چاہتا تھا، زندگی کی آسائشیں اس کے لیے مہنگی بالکل نہ تھیں۔ وہ سردیوں میں لاہور میں قیام پذیر رہتا اور گرمیوں کا موسم کشمیر میں گزار آتا۔۔۔ کشمیر اپنے جنت نظیر نظاروں کے باعث اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف گرمیاں یہاں آکر گزارتے



بلکہ بارشوں میں نہاتے اور ہوا میں جھومتے درختوں کے نظارے بھی کرتے۔۔ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں، ابلتے چشموں اور آبشاروں کے نظاروں سے لطف اٹھاتے، یہاں جس طرح قدرت کے حسین نظارے بے نقاب ہو کر دیکھنے والوں کا استقبال کرتے اسی طرح مردوں اور عورتوں کے چہرے بھی کھلے ہوئے ہوتے۔

ایک دن ہینری نیڈو منہ میں سگار دبائے قدرت کی ان بو قلمونیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کہ اسے سامنے سے کشمیری حسن سے رچا بسا ایک متحرک پیکر دکھائی دیا۔ جسے حسن کی دیوی کہنا بجا تھا۔ یہ چودہ پندرہ سال کی دوشیزہ تھی۔ جو گو جر برادری سے تعلق رکھتی تھی۔ چہرے کی ملاحظت نیڈو کی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ اس کے قد کی جسامت اور طوالت میں بڑی موزونیت تھی۔ ہینری کو اس کی مستانہ چال پسند آگئی۔ اور اس کے لمبے بال اس کی گرفت کے لیے جال بنانے کے لیے کافی تھے۔ اور وہ جان و دل سے اس پر فدا ہو گیا۔

اتفاق سے یہ دوشیزہ اکیلی چلی آرہی تھی۔ آسمان پر کالے بادل بارش کے موتیوں کو بڑی مشکل سے سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا تھا۔ سیر کرنے والے سارے لوگ تیز قدموں کے ساتھ کسی سایہ میں پناہ لینے کی فکر میں تھے۔

ہینری نیڈو جلدی سے آگے بڑھا اس دوشیزہ کا رستہ روک لیا۔ اور کہا  
اگر آپ پسند فرمائیں۔ تو وہ میری گاڑی کھڑی ہے آپ کو اس میں آپ کے گھر  
تک لیجایا جاسکتا ہے۔

گویا لفٹ کی پیش کش کی۔ مگر اس دوشیزہ نے بڑے پروقار طریقے سے انکار کر دیا۔ کہا۔ میرا گھر کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔ بارش شروع بھی ہو جائے تو بھی زیادہ بھگے بغیر گھر پہنچ سکتی ہوں۔

ٹھیک ہے۔ آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔

پھر یکدم تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش اس قدر بوچھاڑ کی تھی کہ دوشیزہ کو مجبوراً "ہینری نیڈو کی گاڑی میں گھسنا پڑا۔

ہینری نیڈو چونکہ اس دوشیزہ کو پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھا تھا۔ لہذا وہ اس پہلی ملاقات میں زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ہمراہ گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر گاڑی کو خراب کر دیا کہ شارٹ نہ ہو سکے۔ اب ہینری بار بار گاڑی کو چلانے کی کوشش کرتا مگر وہ گھوں گھوں کرتی رہی شارٹ نہیں ہو سکی۔ آخر تھک ہار کے کہنے لگا۔

بارش رکتی ہے تو کسی مکینک کو گاڑی دکھانا پڑے گی۔

اس نے یہ موقع جان بوجھ کر پیدا کیا تھا۔ وہ اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی کے شیشے چڑھا دیئے۔ اور بے بسی کی حالت میں دبک کے بیٹھ گیا۔ پھر اچانک کہا۔

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے ابو کیا کام کرتے ہیں۔؟

ہم دودھ بیچنے کا کام کرتے ہیں۔ لوگ ہمیں گوجر کہتے ہیں۔ دوشیزہ نے مسکرا کر

جواب دیا گویا آپ لوگوں کو دودھ پلا پلا کر خوب موٹا تازہ کر رہے ہیں۔ ہینری بولا



(دوشیزہ کا چہرہ متبسم ہو گیا)۔

مزید کہا۔ میرا خیال ہے کہ گھروں میں دودھ دینے کے لیے آپ ہی جاتی ہوں گی۔ نہیں۔ میں پڑھنے کے لیے کالج میں جاتی ہوں۔ دوشیزہ نے بتایا۔

خوب آپ کالج میں جاتی ہیں۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ کیا آپ یہ بات بتانا پسند کریں گی کہ آپ کس کلاس میں اپنی استانیوں سے مار کھا رہی ہیں؟  
یعنی آپ اپنے تجربے کی بات کر رہے ہیں۔ دوشیزہ نے کہا۔

ہینری: ”ہاں جی! ہم نے تو بڑی مار کھائی اپنے استادوں سے“

دوشیزہ: استادوں کی مارنے ہی آپ کو کار میں بٹھا دیا ہے۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کا شغل کیا ہے۔؟

ہینری: میں ہوٹلنگ کرتا ہوں۔ ایک ہوٹل لاہور میں ہے۔ اور ایک سری لنکا میں۔ کیا آپ نے کبھی ہوٹل میں کھانا کھایا ہے؟

دوشیزہ: نہیں! ہمارے پاس ہوٹلوں میں فضول خرچی کیلئے پیسے نہیں ہیں۔ گھر کی دال چپاتی کھا کر ہی ہم خوش ہیں۔

ہینری: کیا ہوٹل میں کھانا کھانے کو جی چاہتا ہے؟

دوشیزہ: میرے چاہنے یا نہ چاہنے میں آپ کو کیا غرض؟ اور ہاں اگر ایک دو بار

کھا بھی لوں تو اس سے زندگی میں کون سا انقلاب آجائے گا۔

ہینری: انقلاب تو آسکتا ہے۔ اگر آپ خود انقلاب لانا چاہیں۔

”وہ کیسے؟“ وہ اس طرح کہ آپ ہوٹل کی مالکہ بن جائیں۔

”میں ہوٹل کی مالکہ بن جاؤں!“ بالکل ناممکن۔ ہم نے تو کبھی خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا۔

نہیں نہیں! اب سوچ لیں۔ اگر آپ مجھے اپنی زندگی میں داخل کر لیں تو مالکہ بننا بالکل آسان ہو سکتا ہے۔  
دو شیزہ شرما سی گئی۔

اب ہینری نے گاڑی خود ہی ٹھیک کر لی۔ اور گاڑی بھگتے راستوں پر بھاگنے لگی وہ پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ دونوں نے مل کر مشروبات سے لطف اٹھایا۔ پھر اسے اس کے گھر تک چھوڑنے کے لیے گاڑی میں بٹھا لیا۔ تاہم اس نے یہ ضرور پوچھا کہ اگر وہ کل سیر کو آئے تو کیا مجھ سے ملنا پسند کرے گی۔ جس کے جواب میں کہا گیا ضرور۔

اب دونوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہینری نیڈور خوب دیا، کھول کر اس پر پیسے خرچ کرتا رہا۔ آخر ایک دن تو ہینری نے واضح لفظوں میں کہہ دیا کہ ہم دونوں زندگی کی مستقل ساتھی بن جائیں۔

دو شیزہ بولی۔ ہمارا مذہب ایسی آزادی نہیں دیتا کہ مسلم اور غیر مسلم سلسلہ مناکحت قائم کر لیں۔

ہینری: تو آپ اپنے مذہب کو چھوڑ دیں۔ میرے مذہب میں داخل ہو کر میری شریک حیات بن جائیں۔

دو شیزہ: نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کو مجھ سے واقعتاً ”محبت“ ہے تو آپ



مسلمان ہو جائیں۔ پھر میں آپ کی زندگی میں داخل ہو سکتی ہوں۔

ہینری: اور اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو؟

دوشیزہ: تو ہم دونوں کے راستے جدا جدا ہیں۔ نہ آپ کی دولت مجھے متاثر کر

سکتی ہے اور نہ میری خوبصورتی آپ کے کام آ سکتی ہے۔

ہینری: نہیں اتنی جلدی آپ یہ سنگدلانہ فیصلہ نہ کریں۔ میں آپ کو

ایک ہفتہ غور کرنے اور سوچنے کے لیے دیتا ہوں۔

دوشیزہ: آپ ایک ہفتہ کہتے ہیں میرا پورے ایک سال بعد بھی یہی فیصلہ ہو

گا۔ البتہ میں تمہیں اسلام قبول کرنے پر غور کرنے کے لیے ایک مہینہ دیتی

ہوں۔۔۔ آپکے اسلام قبول کرنے کی خوش خبری سننے کیلئے میں منتظر رہوں گی۔

آخر ہینری نیڈو نے حسن اور صداقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس نے

اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور 1911ء میں ہینری نے میر واعظ سید محمد یوسف

شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور مسلمان ہو گیا۔

اس طرح جو کل تک ہینری نیڈو تھا آج وہ غلام حسین نیڈو بن گیا۔ اور جس

سرزمین میں بتان ہند مسلمانوں کو کافر کر لیا کرتے تھے آج ایک مسلم دوشیزہ کے لیے

ایک کافر مسلمان ہو گیا۔

ازاں بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ 1917ء یا 1918ء میں ان کے ہاں ایک

لڑکی پیدا ہوئی جو بڑی حسین اور ذہین تھی۔ اور لائق بھی۔ اس نے سرینگر میں

گورنمنٹ سکول میں تعلیم حاصل کی اور سینئر کیمرج کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا

اس کا نام اکبر جہاں بیگم تھا۔ اور اس کی شادی کشمیر کے مشہور لیڈر شیخ عبداللہ سے ہوئی تھی۔ اور وہی ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی والدہ بنیں۔

غلام حسین نیڈو کو اللہ تعالیٰ نے استقامت بخشی اور وہ آخر دم تک اسلام پر قائم رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی مرد حق کی تلاش میں جستجو بھی کرتا رہا۔ تاکہ اسکے دل میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات دور ہو سکیں جو ظاہری علم والوں سے رفع نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی جستجو کے دوران میں اسے لاہور کے باکل قریب (صرف بیس میل کے فاصلے پر) شرقپور شریف میں اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرقپوری کا پتہ چلا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے بتانے والوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کی بارگاہ میں جانے والے باریش ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بڑی محبت سے اپنے چہرے پر ایک چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی سجالی۔

آخر وہ ایک دن اعلیٰ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں شرقپور شریف میں حاضر ہوا۔ اس نے گلے میں دوہین لٹکا رکھی تھی۔

حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔ لنگر سے کھانا کھلایا۔ ازاں بعد دوربین کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔

غلام حسین یہ گلے میں کیا لٹکا رکھا ہے؟

اس نے عرض کیا۔ حضور! یہ دوربین ہے۔

یہ کس کام آتی ہے؟

حضور اس سے دور کی چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔



واہ بھی واہ! یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ یہ کتنی دور تک کی چیزوں کا پتہ دے سکتی

ہے؟

مختلف دو بین مختلف فاصلوں تک کام دے سکتی ہیں۔ یہ دور بین جو اس وقت

میرے پاس ہے ڈیڑھ دو میل تک کی چیزوں کو دیکھنے میں مدد دے سکتی ہے۔

اگر رستے میں کوئی رکاوٹ آجائے تو اس رکاوٹ کے دوسری جانب کی چیزیں بھی

کیا اس سے دیکھی جاسکتی ہیں؟

نہیں حضور!

غلام حسین ایک دور بین میرے پاس بھی ہے، جس کی راہ میں رکاوٹیں حائل

نہیں ہوتیں۔ اور ہزاروں میل دور کی چیزیں دیکھنے میں مدد دے سکتی ہے۔

آپ نے دونوں ہاتھوں سے اوک (پنجابی میں بک) بنا کر آنکھوں پر رکھا۔ فرمایا۔

غلام حسین میں اس دو بین سے لندن تک دیکھ رہا ہوں، آپ کے گھر کا ایک

ایک فرد مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ آپ جلدی کریں لاہور جائیں۔ آپ کے گھر (لندن)

سے لاہور میں ٹیلیفون آیا ہے۔ اور آپ کے کارندے اور نوکر آپ کو تلاش کر رہے

ہیں۔ آپ جتنی جلدی جاسکتے ہیں پہنچیں۔

چنانچہ غلام حسین فوراً چلا گیا۔ وہ راستے میں میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی

باتوں پر غور کرتا رہا۔ کیا میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں جو میرے ساتھ لندن تک

کی ہوئی ہیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں لندن

میں آپ کے گھر کے ایک ایک فرد کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ دعویٰ کیسے درست ہو سکتا ہے

؟۔ میاں صاحب نے تو لندن دیکھا نہیں وہ اس کے گلی کوچوں اور محلوں سے کیسے واقف ہیں۔ اور پھر انہیں ہمارے گھر کے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا؟ لندن تو ایک بہت بڑا شہر ہے۔ لندن میں گھروں کا پتہ پوچھنے پر بھی نہیں ملتا۔

بہر حال غلام حسین جب لاہور پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ لندن سے واقعتاً ٹیلیفون آیا تھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ ان (غلام حسین نیڈو) کی والدہ فوت ہو گئی ہیں۔ جلدی لندن پہنچو۔

اس وقت لندن اور ہندوستان میں ہوائی جہاز کا رابطہ نہ تھا۔ بحری جہازوں کی سروس کام دے رہی تھی۔

غلام حسین ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں لندن پہنچوں گا، تو میری ماں کو سپرد خاک کئے ہوئی ایک مہینہ گزر گیا ہو گا۔ لندن میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا، بعد میں چلا جاؤں گا۔ پہلے اس مرد حق کی بارگاہ میں حاضری دے لوں۔ مجھے تو جس مرد حق کی تلاش تھی وہ مجھے مل گیا ہے۔ میری تو ان سے کوئی خاص بات بھی نہیں ہوئی ہے۔ مجھے لندن کی بجائے وہیں (شرقیہ شریف) جانا چاہیے۔ انہیں کی صحبت میں رہنا چاہیے۔

چنانچہ غلام حسین لندن جانے کی بجائے پھر شرقپور شریف میں پہنچ گیا۔ اعلیٰ حضرت شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ اسوقت مسجد میں تھے۔ دیکھتے ہی فرمایا۔

غلام حسین تم پھر واپس آگئے ہو۔ آپ کی والدہ فوت ہو گئی ہے جب تک تم نہیں جاؤ گے آپ کے اعضاء اسے دفن نہیں کریں گے۔ وہ سرد خانے میں رکھی رہے



گی۔ میں تو شاید آپ کو دوبارہ مل سکوں مگر والدہ کے چرے کو تم دوبارہ نہ دیکھ سکو گے۔ جاؤ جلدی کرو اور لندن پہنچو۔

چنانچہ اعلیٰ حضرت شر قپوری رحمۃ اللہ علیہ نے غلام حسین کو واپس بھیج دیا۔ جب وہ لندن میں پہنچا تو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے گھر والوں نے اسے بتایا کہ اگر تم سال بھر نہ آتے تو بھی ہم نے آپ کی والدہ کو دفن نہیں کرنا تھا۔

غلام حسین نے گھر والوں سے مزید پوچھا کہ ان کی والدہ نے کس دن اور کس وقت وفات پائی تھی؟

انہوں نے جو تاریخ 'دن' اور وقت بتایا وہ اسی دن 'تاریخ' اور وقت سے مطابقت رکھتا تھا جس دن وہ (غلام حسین نیڈو) میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں گیا تھا۔ اور میان صاحب نے اسے اس کی والدہ کی وفات کی خبر دی تھی۔

غلام حسین نے مزید پوچھا کہ والدہ کے نزع کے عالم کی کوئی خاص بات؟ بتایا گیا کہ والدہ آپ کی جدائی میں روتی رہتی تھی اور بار بار کہتی تھی کہ دیکھ لو میرا بیٹا ابھی تک نہیں آیا۔ ہم نے پوچھا کہ یہ باتیں وہ کس سے کرتی ہے؟

کہنے لگی کوئی ایسی شخصیت ہے جس کو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ مجھے حوصلہ دے رہی ہے کہ آپ کا بیٹا آپ کی آخری رسومات میں ضرور شامل ہو گا۔

اس طرح غلام حسین کی کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ زندگی بھر میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور آپ اس کی روحانی تربیت فرماتے رہے۔

حوالہ کیلئے: ہینری نیڈو کی زندگی کا پس منظر جنگ میگزین 5 تا 11 اگست

1983ء

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں آمد کا واقعہ: (i) حاجی غلام یسین بولا (حیات ہیں) شرقپور شریف

(ii) شیخ عبدالرشید مرحوم بقول والد ماجد میاں محمد انور مرحوم شرقپوری

نوٹ: یہ مضمون اکتوبر 1997ء (ماہنامہ نور اسلام) کے لیے لکھا گیا ہے۔ مگر

رسالہ میں شائع ہونے سے پہلے کتاب ہدایں شامل کر لیا گیا ہے۔ (قصوری)





## کنارا بھی سہارا بھی

- ☆ لوگوں میں رہو تو لوگوں کی خدمت کرو۔
- ☆ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جیسا گمان کرو گے اسے ویسا ہی پاؤ گے۔
- ☆ عقیدت اور محبت کا جذبہ جسمانی توانائیاں بھی پیدا کرتا ہے۔
- ☆ جس کے سینے میں شیر کا دل ہو اسے شیروں کے سے کام کرنے چاہئیں۔
- ☆ جس مریض کے علاج میں ڈاکٹر بے بس ہو گئے اس کا علاج معمولی جڑی بوٹیوں سے ہو گیا۔
- ☆ مرد کامل نے قلاؤں کو میاں قادر بخش حکیم بنا دیا۔

گجرات کی تحصیل پھالیہ میں ایک گاؤں پانڈووال کے باہر کوئی ڈیڑھ دو میل دور ایک چھوٹی سی بستی ”مرشد داڈیرہ“ ہے۔ اس بستی کے بانی میاں غلام مرشد ہیں۔ جن گوت ہے۔ میاں غلام مرشد کے تین بیٹے الہی بخش، محمد بخش اور راجا تھے۔

الہی بخش ایک صلح جو اور امن پسند آدمی تھا۔ جب کہ اس کے دونوں بھائی لڑائی جھگڑے کو خود آواز دے کر گلے لگاتے تھے۔ چوریاں ڈاکے اور قتل کرنا ان کا من پسند مشغلہ تھا۔ اور ان وارداتوں میں وہ اپنوں اور بیگانوں میں بھی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سگے بھائی الہی بخش کے موسیٰ چرا کر لے جانے میں انہیں کوئی حجاب نہ تھا۔

چونکہ ان دنوں لوگ تھانہ میں جا کر ریٹ درج کرانا اپنی جگہ سمجھتے تھے اس لئے برادری کے بڑے اور بوڑھے لوگ ان کے جھگڑوں کے فیصلے کر دیتے تھے۔ مگر الہی بخش اس قدر شریف آدمی تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کی شکایت ایسی پنچایت میں بھی نہیں لے جاتا تھا اور کہتا تھا کہ میرے لئے یہ مناسب نہیں کہ میں اپنے ہی بھائیوں کو چور ثابت کروں پس اپنا نقصان برداشت کر لیتا تھا مگر حرف شکایت زبان پر نہ لاتا تھا۔ میاں الہی بخش کو اللہ تعالیٰ نے پانچ بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بیٹوں کے نام طاہر علی عرف طاہری، اللہ داد عرف دادو، قادر بخش عرف قادری اور قادو، حیدر علی عرف حیدری اور زیادہ (عرفی نام) تھے جب کہ بہن کا نام بھاگن تھا۔

یہ بچے بچپن ہی سے چونکہ اپنے چچاؤں کی زیادتیاں دیکھتے آئے تھے اس لیے ان کے دلوں میں چچاؤں اور ان کی اولاد کے بارے میں نفرت ہی نفرت پیدا ہوئی۔ علاوہ ازیں اپنی جان اور مال کی حفاظت کا احساس شدت سے پروان چڑھنے لگا۔ اب وہ اس احساس کی حفاظت بہادر بن کر کرنا چاہتے تھے۔ آخر ایک دن طاہری اور قادو نے اپنے چچاؤں سے برملا کہہ دیا کہ اب آپ کی وراثتوں کی برداشت ہماری قوت سی باہر ہو رہی ہے۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ آپ کی کاروائیوں میں اینٹ کا جواب اینٹ سے اور پتھر کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔۔۔ لیکن انہوں نے اس تنبیہ کا قطعاً کوئی اثر قبول نہ کیا اور ایک رات الہی بخش کی کھڑی فصل کاٹ کر لے گئے اور اپنے مویشیوں کو چارہ کے طور پر کھلا دیا۔

طاہر، اور قادو گئے اور چچاؤں کی گائیں، بھینسیں دودھ لیں۔ کچھ گائیوں اور



بھینسوں کے پچھڑے چھوڑ دئے جنہوں نے اپنی ماؤں کا دودھ پی کر تھن خالی کر دئے۔  
 اس طرح شام کو چچاؤں کے گھر میں دودھ کی ایک بوند تک بھی نہ گئی۔ بڑے  
 شٹائے۔۔۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی ہوا اور پھر سلسلہ چل نکلا، باہمی نقصان ہوتے  
 رہے اور انتقامی جذبات جوان ہوتے رہے۔ جرم کو جرم کہنے کا احساس تک مٹا چلا گیا۔  
 اللہ داد باپ کی طرح امن پسند تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بھائی کسی کا  
 نقصان کریں، کسی کا نقصان کرنے سے اپنی عزت کا نقصان ہوتا ہے۔ اور شہرت خراب  
 ہوتی ہے یہی وجہ تھی کہ اسے طاہری اور قادو کے یہ کام پسند نہیں آئے چنانچہ ایک دن  
 میاں اللہ داد جب گھر میں داخل ہوا تو مرغ پکنے کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کی قوت  
 شامہ کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اپنی بہن بھاگن سے پوچھا جو صحن کی ایک جانب  
 چولہے پر گوشت بھون رہی تھی۔

یہ مرغ کا گوشت کہاں سے آیا ہے؟

قلدی لایا تھا۔

کیا قلدی کے پاس مرغ خریدنے کے لیے پیسے تھے؟

پتہ نہیں کہتا تھا مہمانوں کے لیے کھانا پکانا ہے۔

بس کسی غریب کی مرغی پکڑ لی ہوگی اور وہ اس کی جان کو رو رہا ہو گا۔ اس کے

برے لچھن میری شہرت کو زبردست نقصان پہنچا رہے ہیں۔ پورا خاندان بد نام ہو رہا

ہے۔۔۔ کتنے پیار کے ساتھ اسے سمجھایا ہے مگر اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی

۔۔۔ اب تو میری برداشت کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے میں چاہتا ہوں گھر کے دروازے اس

کے لیے بند کر دوں۔

بھائی جلن یہ ظلم نہ کریں۔ اس کی جدائی مجھ سے براشت نہ ہو سکے گی میں تڑپ تڑپ کر مرجاؤں گی۔

مرتی ہو تو مرجاؤ۔ میری عزت سے کھیلنے والے میرے بہن بھائی نہیں ہو سکتے۔ اتنے میں قادی گھر میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جسے وہ گھما رہا تھا۔۔۔ اس نے گھر کے ماحول کو روٹھا روٹھا پایا۔ بہن ٹسوے بہا رہی تھی۔ بڑے بھائی کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ وہ روٹی ہنڈیا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن گھر کے ناراض ماحول کو دیکھ کر وہ چپ سا ہو گیا۔ اس نے بہن سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ وہ انہیں قدموں پر پلٹا اور باہر جانے کو قدم اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ ایک گرجدار آواز اسکے کانوں میں پڑی۔

ادھر آؤ قادی! اب کہاں جانے لگے ہو۔۔۔ مجھے بتاؤ یہ مرغی کا گوشت کہاں سے آیا ہے؟

قادی چپ چاپ بت بنا کھڑا رہا۔۔۔ بڑا بھائی قریب آیا۔ گریبان سے پکڑا اور جھنجھوڑتے ہوئے پھر پوچھا۔۔۔ تمہاری زبان تالو سے کیوں لگ گئی ہے بولو! یہ چوری کی مرغی کیوں گھر میں لائے؟

یہ تو پیسہ (فقیر محمد کا عرفی نام) نے پکڑی تھی۔

مگر کھاؤ گے تم سب مل کر۔۔۔۔۔ بدنامی ہوگی میری۔۔۔۔۔ میں تو تیری ان بری عادتوں سے تنگ آگیا ہوں تیرا وجود اس گھر کے لئے اب ایک بوجھ محسوس کرنے







کی اولاد کے ساتھ برابر کی ٹھنی رہی۔۔۔ ایک دن ان کے موسیٰ قادو برادران کی کھیتوں میں گھس آئے۔ سارا کھیت تباہ کر دیا۔ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ بت بڑھتے ہوئے بے قابو ہو گئی۔ لائٹھیاں اٹھیں، ضربیں آئیں، پھر ایک بھالے کی تیز آگے بڑھی اور چچا زاد بھائی کے سینے سے پار ہو گئی وہ نیچے گرا اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

میاں غلام مرشد کے اس پہلے قتل نے قادو کو بھاگ جانے پر مجبور کر دیا دوسرے چاروں بھائی اور باپ الٹی بخش قتل کے جرم میں پکڑ لیے گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد بری ہو کر واپس گھر آ گئے۔۔۔۔۔ قادو نہ تو پکڑا گیا نہ ہی سزا بگھتی نہ بری ہوا اور نہ ہی واپس گھر آیا۔۔۔۔۔ وہ ”مرشد دے ڈیرے“ سے نکلا اور چلتا گیا اس طرح پانڈو والا کی دیواروں کی سائے اس سے دور ہتے گئے۔۔۔۔۔ اور قادو یا قادو کے نام سے پہچانا جانے والا سات فٹ لمبا بائیس سالہ جوان غصے کے پشتارے اٹھائے 1901ء کی نومبر کی ٹھنڈی اور کالی رات میں لاہور کی جانب چل دیا۔

چونکہ منزل کا تعین نہ تھا۔ اس لیے جگہ جگہ رکتا جاتا تھا۔۔۔۔۔ لاہور پولیس کے ایک اہل کار نے اسے آوارہ اور وارداتیا خیال کیا اور اسے ایک چھتری لگا دی۔۔۔۔۔ قادو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سپاہی کو پکڑا اسے ایک ہتھی دی اور زمین پر دے مارا۔ دو چار گالیاں دیں اور ٹھڈے بھی رسید کیے۔ قبل اس کے لوگوں کا ہجوم بنے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جائے وراوت سے دور نکل گیا۔ اس نے پیچھے گھوم کر بھی نہ دیکھا کہ سپاہی اپنے کپڑے جھاڑ کر کب اٹھا۔۔۔۔۔ اسے یہ خوف ضرور لاحق تھا کہ پولیس کے دوسرے کارندے اسے پکڑ لیں گے۔ اسی لیے وہ رواں قدموں کے ساتھ



چل رہا تھا کہ اچانک ایک مضبوط ہاتھ نے اس کے کندھے کو دبوچ لیا۔

نوجوان سہم گیا۔ یہ ضرور کوئی پولیس والا ہوگا۔ مگر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کا اندازہ بالکل غلط نکلا۔ یہ پولیس والا نہیں تھا بلکہ پختہ جسم والا ایک کڑیل جوان تھا۔ بالکل اجنبی تھا کوئی شناسائی نہ تھی، لمبی لمبی موچھیں تھیں، چہرہ بے ریش تھا، اوپر کے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا، جو گفتگو کرنے پر بڑا نمایاں ہو کے دکھائی دیتا تھا۔

نوجوان قادو نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔  
ایسے لگتا ہے تم تھکے ہوئے بھی ہو اور بھوک کے ستائے ہوئے بھی۔۔۔۔۔ یہاں ہوٹل میں کھانا کھاؤ گے یا میرے ساتھ گھر میں جا کر؟  
نوجوان قادو اس پیش کش پر حیران تھا۔۔۔۔۔ کہ ایک اجنبی پر اس قدر التفات کیوں؟

بھوک اسے واقعتاً تھی اور ہر لمحے اس کے جسم میں نقاہت پیدا کر رہی تھی لہذا اس نے ہوٹل میں جا کر کھانا کھانے کو ترجیح دی۔

قریب کے ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھے تھے کہ روسٹ کئے ہوئے مرغ مسلم کی رکابیاں آگئیں۔ نوجوان حیران تھا کہ ان عنایتوں کی تمہ میں کون سا لالچ پنہاں ہے وہ تو بس دال چپاتی کو ہی ان برے حالات میں غنیمت جانتا تھا۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ میرے ساتھ کھنڈ میں جائیں گے۔

کھنڈ! کھنڈ کیا ہے؟

کھنڈ میرے گاؤں کا نام ہے۔ کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔ رائے ونڈ کو جانے والی اصل روڈ پر واقع ہے۔ اجنبی نوجوان نے قادو سے کہا۔

مگر میرے مہربان دوست میں آپ سے بالکل ناواقف ہوں اور آپ کی عنایتیں واقفوں سے بھی زیادہ ہیں۔ اس محبت کی مہمان نوازی آپ لوگوں کا شیوا ہے یا اس کے پاتال میں لالچ کی دنیا آباد ہے۔۔۔۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے آپ کے ہاں جا کر کیا کام کرنا ہوگا؟

دیکھیں بھئی آپ نے سپاہی کو مارا۔ سپاہی کو کوئی معمولی آدمی نہیں مار سکتا۔ وہی مار سکتا ہے جس کے سینے میں شیر کا دل ہو۔ شیر کے دل والے لوگ شیروں کے سے کام کرتے ہیں۔ بزدلی ان سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔

کیا مجھے آپ کے کھیتوں میں ہل چلانا ہوں گے؟ قادو نے کہا۔

ہل چلانا بھی کوئی کام ہے۔ ہل چلاؤ، سہاگہ پھیرو، بیج کو زمین میں دفن کرو، خود مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاؤ۔ چھ مہینے تک فصل پکنے کا انتظار کرو تب کہیں جا کر پیسے کا منہ دیکھو۔ ہم تو میاں ہر رات پیسوں کا منہ دیکھتے ہیں اور روزانہ پیسوں کے ساتھ کھیلتے ہیں، نہ پیسہ کمانے میں، وقت نہ پیسہ خرچ کرنے میں تکلیف، جیبیں بھری رہتی ہیں نوٹوں سے۔

قادو نوجوان کی باتوں کے شیشے میں اتر گیا۔ وہ اس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کر اس کا ساتھ دینے کے لیے کھنڈ میں چلا گیا۔۔۔۔ یہ نوجوان امام دین کھنڈ تھا نامی گرامی ڈاکو، چور، لٹیرا، رسہ گیر اور قاتل۔۔۔۔ قادو پانچ سال تک امام دین کھنڈ کی پناہ میں



رہا۔ اس دوران میں اس کی ملاقات رنگیں پور کے عمر اجویہ اور فتح محمد عرف فتوڑیما جھینڈو اور کالا کھنڈ سے بھی ہوئی۔ ان کی صحبت اور تربیت سے قادو، قادا ڈاکو بن گیا۔ اس کے ٹھکانے بدلتے رہے۔ کبھی یہ کھنڈ میں رہا، کبھی چمرو پور، کبھی ستوکی، کبھی مانک، کبھی ارائیاں والا، کبھی پاجیاں، کبھی لکھووالی اور کبھی جھینڈو والی میں۔

ان علاقوں کے جرائم پیشہ لوگ سب ایک دوسرے کے وفادار ساتھی تھے۔ جو نہی ان لوگوں کی سرگرمیاں تیز ہو جاتیں ارد گرد کے علاقوں میں وارداتیں ہی وارداتیں ہونے لگتیں۔ چوریاں ہوتیں، قتل ہوتے، ڈاکے پڑتے، کھرے (نقوش) دابے جاتے مگر وارداتیہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھتے۔

قادو اس گروہ میں ایک عام کارکن کی حیثیت سے آیا تھا مگر بڑے چھوٹے اس کی وارداتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ قادا ڈاکو کے نام سے مشہور ہو گیا اب قادا ڈاکو اپنے ایک گروہ کا خود سردار تھا۔

ایک دن قادا سرشام کھیتوں کی پگڈنڈی پر سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک بڑھیا ملی جو لائٹھی کے سہارے چلی جا رہی تھی، مکئی کے بھٹوں کی ایک چھوٹی سی گٹھری اس کے سر پر تھی۔ قادو نے اس گٹھری کو اچک لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں ضرور قیمتی چیزیں ہوں گی مگر اس میں تو اوپر سے نیچے تک بھٹے ہی بھٹے تھے۔۔۔۔

اب اس نے خفت مٹانے کے لیے بڑھیا سے کہا ماں جی آؤ میں آپ کو منزل تک پہنچا دوں۔۔۔۔ بڑھیا اس کے پیچھے پیچھے چلتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کا گھر آگیا۔۔۔۔ قادو نے گٹھری بڑھیا کے حوالے کی اور جانے لگا۔۔۔۔ بڑھیا نے اس کے



حق میں دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تیری زندگی لمبی کرے تو اسی طرح لوگوں کے کام آتا رہے،  
لوگوں سے دعائیں لیتا رہے، کسی نیک ماں کا جلیا ہوا لگتا ہے تو۔۔

قادا چلا گیا۔ اس نے بڑھیا کے لفظوں پر کچھ توجہ نہ کی۔ وہ تو بس لوگوں کو لوٹنے  
کے لیے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں سے بددعائیں لینے کے لیے اس دنیا میں آیا تھا۔۔۔۔ ڈاکے  
اور قتل اس کی قسمت میں لکھے تھے۔ مگر اسے کیا خبر اس بوڑھی ماں کی دعائیں اس کے  
کام آجانی تھیں۔

انہیں دنوں اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرپوری کی شہرت  
فلک کی رفعتوں کو چھو رہی تھی۔ امراء۔ غرباء۔ علماء۔ عشاق میں آپ کا تذکرہ تھا۔ کوئی  
لوگوں کے ساتھ ان کی محبت کی باتیں کرتا کوئی ان کے تقویٰ کا ذکر کرتا، کسی کی زبان پر  
ان کے زہد کی گفتگو ہوتی اور کوئی ان کے تصرفات و کرامات کو زیر بحث لاتا۔

حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر قادیان ڈاکو کی محفل میں بھی ہونے  
لگا۔۔۔۔ مگر یہ ذکر ان کے زہد و تقویٰ کا نہ تھا، خدمت خلق اور خشیت الہی کا نہ تھا۔ ان  
کے کشف و کرامت کا نہ تھا۔۔۔۔۔ وہ تو بس ڈاکو اور لٹیرے تھے ان میں مال لوٹنے کی  
باتیں ہوتیں۔ ان کی نظر لوگوں کی آمدن و خرچ پر رہتی ہے۔ اگر آمدن ہے تو آمدن کا  
رہیہ کہاں رکھا جاتا ہے اگر خرچ دیکھتے تو اس ٹوہ میں رہتے کہ کس خزانے سے نکال کر  
خرچ کر رہے ہیں۔

ان لوگوں میں میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اس نسبت سے تھا کہ میاں  
صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس قدر مہمان آتے ہیں۔ ان کی خدمت میں جو اتنا



زیادہ خرچ کرتے ہیں یقیناً" ان کی کئی تجوریاں بھی ہوں گی۔۔۔۔۔ یہ لوگ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خزانے لوٹنا چاہتے تھے۔ "اولاً" ان لوگوں نے ان کی تجوریوں کا پتہ لگانا تھا پھر ڈاکہ یا چوری کا پروگرام بنانا تھا۔

اس کام کی ذمہ داری قادا ڈاکو کے سپرد ہوئی کہ وہ پتہ کرے کہ اتنی دولت کہاں سے آتی ہے؟ کہاں رکھی جاتی ہے؟ اس دولت تک ہمارے ہاتھ کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟ چنانچہ قادا ڈاکو ایک مہمان کی حیثیت سے شرقپور شریف میں آیا۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ وہ نووارد مہمان کے پاس خود تشریف لے جاتے اور اس کی خیریت و عافیت پوچھتے۔۔۔۔۔ عادت کے مطابق آپ رحمۃ اللہ علیہ قادا ڈاکو کے پاس بھی آئے اور پیار سے پوچھا۔

ہاں بیلیا! آپ کہاں سے آئے ہیں؟ آپ کو کس نام سے پکارا جاتا ہے۔  
والدین نے تو میرا نام قادر بخش رکھا تھا مگر لوگوں نے مجھے قادی، قادو اور قادا کے نام سے ہمیشہ پکارا ہے۔ قادر بخش کسی نے بھی نہیں کہا۔  
تمہیں کس نام کی آواز میں راحت ملتی ہے؟  
جو بگاڑ کر نہ بولا جائے۔

یعنی قادر بخش نام آپ کو زیادہ پسند ہے۔

ازاں بعد آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور تین بار فرمایا۔  
یا قادر! بخش! یا قادر! بخش! یا قادر! بخش۔۔۔۔۔ اس کے بعد آپ نے دسترخوان بچھوایا اور  
کھانا لگوا دیا۔ پھر قادر بخش کی پیٹھ پر تھپکی دی اور فرمایا خوب سیر ہو کر کھانا کھاؤ، کام شاید

تمہاری مرضی کے مطابق نہ ہو۔۔۔۔۔ فقیر کے لنگر سے کھانا ضرور ملتا ہے اس کھانے میں شرمنا نہیں چاہیے۔ ویسے بھی انسان سارے کام روٹی کے لیے کرتا ہے۔ کام خواہ ہو یا نہ ہو روٹی ضرور کھانی پڑتی ہی تمہارا کام تو ویسے بھی ہوتا نظر نہیں آتا لہذا کھانا تو خوب اچھی طرح کھاؤ۔

قادر بخش بڑا قوی الجبہ سات فٹ بلند قامت کا جوان تھا۔ وہ دس بارہ روٹیاں ایک ہی وقت میں کھا جاتا تھا مگر میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دسترخوان سے دو سے زیادہ روٹیاں نہیں کھا سکا۔۔۔۔۔ وہ آٹھ دن تک یہاں رکا رہا۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خزانوں کا سراغ لگاتا رہا مگر خزانے اسے کہیں نظر نہ آئے۔ یہ خزانے تو قدرت کے عطا کردہ تھے۔ انہیں نہ چوروں کا ڈر تھا نہ ڈاکوؤں کا خوف، انہیں صرف میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی دیکھ سکتے تھے۔ قادے ڈاکو کی آنکھ کی رسائی وہاں تک نہ تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔

آخر اتنے دنوں کے بعد قادا حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے کر روانہ ہونے لگا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے تھوڑی سی چپاتیوں میں کچھ سالن لپیٹ کر اسکو دیں اور قصبہ کے باہر شیخانیوں کے کھوہ تک اسے چھوڑنے گئے اور فرمایا۔  
قادر بخش ذرا احتیاط سے جانا۔

قادا اپنے گاؤں روانہ ہو گیا۔ آج وہ بڑا خوش تھا اسے ایک لمبی مدت کے بعد کسی نے قادر بخش کہا تھا اور وہ بھی ایک ولی اللہ نے۔ قادا ڈھانے والے ذخیرہ (جنگل) میں گذر رہا تھا نہ جانے اسے کیوں ہوا کہ وہ قادا جو رات کے اندھیروں میں سنان جنگلوں



اور بیلوں میں سے گزرتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہ کرتا تھا آج اس کے دل میں ایک ان جانا خوف پیدا ہو رہا تھا۔ وہ گاہے آگے قدم اٹھاتا گاہے پیچھے کیطرف چلنے لگتا۔ وہ بڑی مشکل سے جنگل کی نہر کے دوسرے کنارے تک گیا تو اس کی زبان پر اللہ کا ورد جاری ہو گیا۔ وجدانی کیفیت اس قدر غالب آئی کہ رقص کرنے لگا اس نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے وہ کسی کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ آخر بیہوش ہو کر گر پڑا۔ چوبیس گھنٹے تک اس بے خودی کی حالت میں جنگل میں پڑا رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ قادا ڈاکو سے اب میاں قادر بخش بن رہا تھا۔ سارا دن بے سدھ حالت میں پڑا رہا۔ رات بھی ایسے ہی بیت گئی۔ اگلی صبح وہ ہوش میں آیا۔ اسنے اپنے آپ کو دیکھا تو شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔ کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ برہنگی کی حالت ہے جسم پر جگہ جگہ خراشیں آئی ہوئی ہیں۔ خون رس رہا تھا۔ اس کا غرور، تکبر اور رعونت مفقود ہو چکے تھے۔ اسنے پھٹے ہوئے کپڑوں کی دھجیاں اکٹھی کیں۔ جسم کے خاص حصوں کو ڈھانپا اور مجنون صورت بن کر شرقپور شریف کی جانب چل دیا۔ جو اسے دیکھتا ہنسی آجاتی۔۔۔۔۔ بچوں نے تالیاں بجانے شروع کر دیں۔ مگر چیتھڑوں میں لپٹا ہوا یہ خاک آلود نوجوان نیم بیہوشی کی حالت میں ملکانہ گیٹ کی طرف سے شرقپور شریف میں داخل ہوا۔

گلی کی نکڑ پر پہنچا تو اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرقپوری کو منظر پایا۔ قادا ایک قیدی کی حیثیت سے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ قادا جو قید کرنے والوں سے نہ ڈرتا تھا آج ایک ولی کامل کے سامنے قیدی بنا کھڑا تھا۔



حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا قادر بخش تم بڑے بہادر اور نڈر تھے۔  
میں نے تمہیں روانہ ہوتے وقت ہی کہا تھا کہ ذرا احتیاط سے جانا مگر احتیاط تمہاری  
برداشت سے باہر ہو گئی۔

قادر بخش چپ تھا۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسے اندر بیٹھک میں  
لے گئے۔ ہاتھ منہ دھلایا اور اچھے کپڑے اسے پہننے کو دیئے۔ اپنے سامنے بٹھایا اسے  
تھپکی دی۔ نماز روزے کی تلقین کی اور مزید فرمایا پہلے تم قاداؤ کو تھے مگر آج کے بعد تم  
میاں قادر بخش ہو۔۔۔۔۔ جاؤ اب اپنے گھر چلے جاؤ۔

مگر قادر بخش نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ عرض کیا حضور! اب میں کہیں بھی جانے کا  
نہیں ہوں بس اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دیجئے۔

نہیں قادر بخش آپ کے کچھ ساتھی آپکے انتظار میں ہیں۔ انہوں نے جس کام  
کے لیے آپ کو بھیجا تھا اس کے متعلق جا کر انہیں تفصیلاً بتاؤ۔۔۔۔۔

قادر بخش چلا گیا واقعتاً اس کے دوست اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے جس مشن پر  
اسے بھیجا تھا۔ اس کے بارے میں دریافت کیا۔۔۔۔۔ قادر بخش کی آنکھوں سے آنسوؤں  
کی برسات ہونے لگی۔ اس نے روتے روتے عرض کیا۔

مجھے آپ نے جہاں بھیجا تھا میں تو وہیں کا ہو گیا ہوں۔ اب میں آپ کے کام کا  
نہیں رہا۔

ان لوگوں نے قادر بخش سے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تصوف کی باتیں  
سنیں تو وہ بھی اپنے برے کاموں سے تائب ہو گئے۔



قادر بخش کی حالت میں اس قدر تبدیلی آئی کہ جو پہلے نماز کے نام سے بھاگتا تھا اب نہ صرف نماز پنجگانہ کا پابند ہو گیا بلکہ تہجد گزار بن گیا۔  
ایک دن میاں قادر بخش حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا  
عرض کیا۔

حضور! جس کام کو میں نے زندگی بھر کیا وہ تو آپ کی دعا سے اب مجھ سے چھوٹ گیا اب میں کیا کروں؟  
آپ نے فرمایا کسی کو دوا دارو دے دیا کرو۔

قادر بخش حیران ہو گیا اور سوچنے لگا کیا ان پڑھ بندہ بھی حکیم بن سکتا ہے یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔ چند دن کے بعد پھر قادر بخش نے آپ کی خدمت میں یہی سوال کیا کہ حضور میں کیا کام کروں؟

حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اب کے بھی یہی جواب دیا کہ کسی بیمار کو دوا دارو دے دیا کرو اب بھی اس نکتے کو سمجھنے میں قادر بخش کی عقل نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اٹھے اور ایک کتاب اٹھالائے۔ فرمایا یہ کتاب لے جاؤ۔ یہ حکمت کی کتاب ہے۔ بیماریوں کے علاج کے بارے میں اس میں بہت کچھ لکھا ہے۔

۔۔۔ چونکہ تم مستقبل کے بننے والے حکیم ہو، حکیموں کے لیے اس کتاب کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

میاں قادر بخش نے کتاب کو پکڑ لیا مگر اٹے رخ اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

عرض کیا حضور! میں تو کورا ہوں مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ یہ کتاب میرے کس کام کی؟

نہیں یہ کتاب آپ کے کام کی ہے۔ یہ پڑھنی بھی آجائے گی۔۔۔۔۔ بس جو کوئی

پڑھا لکھا گزرے اس سے چند سطریں پوچھ لیا کرنا پندرہ بیس صفحے پڑھ لو گے تو پھر حرف شناس ہو جاؤ گے۔

ایک دن اتفاق سے قادر بخش ایک پنسار کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ گاؤں کا ذیلدار

جس کا نام اجاگر سنگھ تھا کو گزرتے دیکھا۔۔۔۔۔ اجاگر سنگھ کی بیوی ٹی۔بی کی پرانی مریضہ تھی۔ میاں قادر بخش نے پوچھا۔

سردار جی آپ کی بیوی کی اب طبیعت کیسی ہے؟

سردار جی نے بڑے دکھے دل کے سے کہا اس کے حالت بڑی خراب ہے بالکل

ہڈیوں کا پنجر بن چکی ہے، ڈر ہے کہیں پر ماتما کو پیاری نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو

میری زندگی بھی برباد ہو سکتی ہی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ویران ہو جائیں گے۔

سردار جی گھبرائیں نہیں میں آپ کی بیوی کا علاج کروں گا۔

قادر بخش! تم اس کا علاج کیسے کرو گے تم کون سے حکیم ہو؟ اس کے علاج میں

تو بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر بے بس ہو گئے ہیں۔

سردار جی! میں سچ کہتا ہوں مجھے امید ہے کہ میرے علاج سے آپ کی بیوی مکمل

صحت یاب ہو جائے گی۔

اچھا میاں! تم بھی علاج کر دیکھو۔



اگر آپ کی بیگم صحت یاب ہو جائے تو انعام میں کیا دو گے؟

میاں جی علاج کرو اس کی صحت یابی پر جو آپ کہیں گے وہ آپ کو مل جائے گا۔  
نہیں ایسے نہیں ملے کر لیں ایک صد روپیہ اعلیٰ قسم کی ایک بھینس اور ایک  
گھوڑی لوں گا۔

منظور ہے اجاگر سنگھ نے کہا۔

میاں قادر بخش نے وہیں پنساری سے سوڑیاں، عذاب اور ملٹھی وغیرہ معمولی  
قسم کی چیزیں لیں اور کوٹ کر پڑیاں بنا کر اجاگر سنگھ کے حوالے کیں۔

پنساری اور اجاگر سنگھ دونوں ان دوائیوں پر ہنس پڑے اور میاں قادر بخش کا مذاق  
بھی اڑایا۔

اجاگر سنگھ! اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، آپ نے اتنے مہنگے علاج کئے  
ہیں یہ معمولی علاج بھی کر کے دیکھو، صرف تین دن کے بعد آپ کی بیوی صحت یاب  
ہونے لگے گی۔

واقعاً! ایسا ہی ہوا، تین چار دن کے بعد اجاگر سنگھ کی بیوی ٹھیک ہونے لگی۔ اور  
ایک مہینے میں ایک دو دن باقی تھے کہ وہ گھر کے کام کاج کرنے لگی اور وہ نحیف و نزار  
عورت جو چارپائی کے ساتھ چارپائی ہو چکی تھی۔ خود چل کر اپنے میاں (اجاگر سنگھ) کے  
ہمراہ میاں قادر بخش کے پاس آئی۔

پرنام کرتے ہوئے سر ہلکا جھک گئی۔ عرض کیا میاں صاحب آپ نے مجھے دوبارہ  
زندگی دی ہے آپ نے وعدہ پورا کر دکھایا ہے۔۔۔۔۔ آخر ہمارے ساتھ نبیلے میں اپنی

مرضی کی بھینس اور گھوڑی پسند کر کے لے لیں۔

بیلے میں اعلیٰ نسل کی بھینسیں اور گھوڑیاں کھڑی تھیں۔ میاں قادر بخش نے اپنی مرضی اور پسند کی گھوڑی اور بھینس لے لی۔ پھر انہیں ایک سو روپیہ بھی دے دیا گیا۔ جب میاں قادر بخش گھر واپس آنے لگے تو اجاگر سنگھ نے کہا میاں صاحب! وعدہ کے مطابق آپ کو انعام مل گیا ہے اب ہم اپنی طرف سے ایک گھوڑی، ایک بھینس اور پانچ صد روپیہ پیش کرتے ہیں وہ بھی قبول فرمائیں۔

لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ فرمایا میں جو کچھ کہا تھا وہ میں نے لے لیا ہے اس کے علاوہ ایک پائی بھی نہ لوں گا۔

اجاگر سنگھ کی بیوی کی صحت یابی ان کے حکیم ہونے کا اشتہار بن گئی۔ جو مریض آتا آپ اس کا علاج بالکل معمولی جڑی بوٹیوں سے کرتے اور علاج کا معاوضہ شروع میں طے کر لیتے پھر اس سے ایک پائی تک زائد نہ لیتے۔۔۔۔۔ بعض بے سمجھ لوگ کہتے کہ معاوضہ طے کر کے علاج کرنا درست نہیں ہے کیونکہ شفا من جانب اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ مریض کو صحتیاب نہ کرے تو ان کے دعوے کدھر جائیں گے۔

آپ اس کے جواب میں فرماتے اللہ کسی کو مایوس نہیں کرتا اس پر جیسا گمان کرو گے ویسا کر دیتا ہے۔ اقبال اس لیے تو کہتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور یہ بھی فرماتے اللہ تعالیٰ میرے پاس وہی مریض بھیجتا ہے جسے اس نے



صحت دینی ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ میں خود علاج تھوڑا کرتا ہوں میں تو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ (اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شریقوری) کے ارشاد کے مطابق بس دوا دارودے دیتا ہوں۔

میاں قادر بخش کے پاس اب دولت کی فراوانی ہو گئی آپ نے چمرو پور میں 80 ایکڑ زمین 3300 روپے میں خرید لی۔۔۔۔۔ آپ کہا کرتے اتنے ڈاکے مارے اتنی چوریاں کیں اتنے قتل کئے مگر دولت نے منہ موڑے رکھا۔ ہم خود چھپ چھپ کر رہا کرتے جب سے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نظر کرم کی دولت کی نہر کا رخ اس طرف ہو گیا اب ہمیں لوگوں سے چھپنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ لوگوں میں رہ کر لوگوں کی خدمت کرنے کی ضرورت ہے۔

میاں قادر بخش کی عقیدت اور محبت اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے روز افزوں رہی۔ وہ ایک دو مہینے کے بعد حضرت قبلہ کی قدم بوسی کے لیے ضرور آتا اور جب حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا وہ بھی آپ کے مزار اقدس پر آکر مراقب ہوتا۔۔۔۔۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقعہ پر پانی کے استعمال کیلئے جو کنواں بنایا گیا اس کے پڑانہ کی جگہ بہت نشیب میں تھی اس میں بھرتی ڈالنے کے لیے میاں صاحب کے جواں سال مرید نوکریوں سے مٹی لانے لگے تو ان میں ایک بوڑھا بابا بھی بہت بڑا نوکرا لئے شامل تھا۔ اس نوکرے میں دوسرے لوگوں کی نوکریوں سے دگنی مٹی آتی تھی۔ وہ اپنے اس کام کے دوران میں خوب ہلا شیری بھی کر رہا تھا۔۔۔۔۔ یہ بوڑھا بابا میاں قادر بخش ہی تھا۔ میاں

قادر بخش نے اپنے مرشد کے وصال کے تقریباً 8 سال بعد 12 چیت 1993  
 بکری، 10 محرم الحرام 1355ھ بمطابق یکم اپریل 1936ء بروز بدھ انتقال  
 فرمایا۔ انہیں چروپور کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔  
 ماہانہ نور اسلام اکتوبر 1994ء





## نعت کی برکتیں

- ☆ اللہ والے سماعت و بصارت کی بے پناہ قوتیں رکھتے ہیں۔
- ☆ مرد کامل نے جسے سینے سے لگا لیا وہ عمر بھر کیلئے دوسروں کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔
- ☆ ولی کامل کی نگاہ نے نعت خواں سے خطیب پاکستان بنا دیا۔
- ☆ ایک کم تعلیم یافتہ مرید مصنف اور محقق بن گیا۔
- ☆ مرشد کامل سے انتہائی عقیدت مندی کا اظہار۔

1945ء سے ادھر کی بات ہے، میں جامع مسجد حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت سید الف شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حسن تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے دل میں شاگردوں کا بے حد پیار بھی رکھتے تھے۔ اسی پیار کی وجہ سے ایک کثیر تعداد میں طلبہ صبح و شام آیا کرتے تھے صبح وہ کہ صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے اور شام وہ کہ شام کی نماز بھی جماعت کے ساتھ پڑھ کر اکثر بچے گھروں میں جاتے تھے۔۔۔ حضرت قبلہ ثانی لاٹانی میاں غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ والی صف میں کھڑے ہو کر کئی نمازیں پڑھنے کا شرف مجھے حاصل ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد بلند آواز میں صلوٰۃ و سلام

پڑھا جاتا۔ پھر دعائے ننگے کے بعد ایک لمبی چادر بچھا دی جاتی جس کے دونوں طرف بیٹھ کر نمازی شمارے پڑھا کرتے۔ (یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے) اس دوران میں حضرت قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی نعت خواں سے ایک نعت شریف بھی سنا کرتے۔ انہیں نعت خوانوں میں ایک دن کوئی پندرہ سولہ سال عمر کا ایک نیا لڑکا بھی نعت شریف پڑھنے لگا۔ اس کی آواز میں سوز اور ترنم تو ضرور تھا مگر نعت خوانی کی فن کے تار کافی حد تک ڈھیلے تھے۔ اس کمزوری کو اگرچہ سب نے محسوس کیا مگر ثانی صاحب قبلہ نے اس لوچدار آواز میں بے شمار نغمے اور زمزے محسوس کیے۔

نعت خواں نے جب نعت ختم کی تو حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور فرمایا۔

ماشاء اللہ بڑے ہونہار دکھائی دیتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟

کھیم کرن سے۔

شیخ حاجی کرم الہی کو جانتے ہو؟

جی! وہ میرے والد محترم ہیں۔

وہ کیسے ہیں؟

بالکل ٹھیک ہیں میں انہی کے ساتھ آیا ہوں۔ وہ بیٹھے ہوئے ہیں بچے نے ایک

عمر رسیدہ شخص کی طرف اشارہ کیا جو سر جھکائے بیٹھا تھا اور درود پاک کے ورد میں مشغول تھا۔

حاجی کرم الہی شیخ اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شر قپوری کے



حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ آپ اس سعادت پر بڑا فخر کیا کرتے تھے۔

کیا پڑھے ہو اور کیا پڑھ رہے ہو؟

آٹھ جماعت تک سکول پڑھا ہے۔ اب قرآن پاک حفظ کر رہا ہوں۔

قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے خوش ہوئے۔ آپ نے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا ہمارے ہاں کے درس میں ایک لڑکا بڑی اچھی نعت پڑھتا ہے، اس سے آپ کو ملواؤں گا۔ کچھ خاص خاص باتیں اس سے سمجھ لینا تاکہ تم ایک اچھے نعت خواں بن سکو۔۔۔ اس مقصد کے لیے اپنے ابو سے چند دن کی یہاں رکنے کی اجازت حاصل کر لو۔

ایک گوشے سے آواز آئی میری طرف سے رہنے کی اجازت ہے۔ یہ آواز اس نوجوان کے والد کی تھی۔۔۔ پھر یہ نوجوان حضرت قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پیچھے ان کے حجرہ شریف میں چلا گیا اور ساتھ ہی اس نوجوان کے والد شیخ حاجی کرم الہی بھی۔ باپ نے عرض کیا حضور اسے اپنی غلامی میں داخل فرما لیجئے۔ بیعت فرمائیے اور اچھے کاموں کی تلقین کیجئے۔ پھر نوجوان بیعت ہو کر حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ مریدین میں شامل ہو گیا۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب اس سے بھی چھوٹا ایک طالب علم بلایا گیا جس کا نام نور محمد تھا اور ”نوشاہی بچے“ کے نام سے مشہور تھا آج وہی بچہ حضرت علامہ نصرت نوشاہی بن کر بیسمار فنون کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔

حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ نے فرمایا۔

نوشاہی بیٹا! یہ ایک نیا نوجوان ہمارے پاس آیا ہے نعت پڑھنے کی صلاحیتیں اس میں موجود ہیں۔ بس تھوڑی سی اس کی رہنمائی کر دو۔

یہ نوشاہی بچہ عمر کا دسواں سال گزار رہا تھا نہایت دبلا پتلا متانت اور سنجیدگی کا پیکر تھا اس چھوٹی عمر میں بھی اس کی باتوں میں پختگی تھی، یہ بات کیوں نہ ہوتی یہ بھی تو آخر شرقپور شریف کے ایک ولی کامل حضرت میاں نیک محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چشم و چراغ تھا۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد سن کر یہ بچہ سوچ رہا تھا میں چھوٹا ہوں اور نعت کے رموز سیکھنے والے مجھ سے بڑے ہیں۔ عرض کیا۔

جیسے آپ حکم فرمائیں گے میں بجالانے کو تیار ہوں۔ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ایک نعت دی کہ جا کر اس کی مشق کریں۔ پھر دونوں بچے مسجد کے دائیں جانب والے دالان میں جا کر بیٹھ گئے اور ننھے منھے مومنوں سے کبھی مدہم اور کبھی اونچی آواز سے نعت کے نغمے پھوٹنے لگے۔

کوئی ہفتے عشرے کے بعد اسی نوجوان نے ایک دن صبح کی نماز کے بعد شمارے پڑھنے کے دوران میں یہ نعت پڑھی۔

شہد سے میٹھا محمد ﷺ نام

شہد سے میٹھا محمد ﷺ نام

میم مئے توحید پلائے اور ”ح“ پھر آگے حق سے ملائے

دوسری میم مراد دلائے



اور یہ دال محمد ﷺ والی

دور کرے آلام

شہد سے بیٹھا محمد ﷺ نام

میم سے ہے ہر دکھ کا مداوا "ح" سے حامی ہر بیچارہ

دوسری میم یتیم کی بچا دال بچا کر دوزخ سے

فردوس کا دے پیغام

شہد سے بیٹھا محمد ﷺ نام

میم سے ہیں محبوب وہ رب کے "ح" سے حاکم عجم و عرب کے

دوسری میم سے مالک سب کے دال سے داتا دونوں جہاں کے

جود ہے ان کا عام

شہد سے بیٹھا محمد ﷺ نام

میم محبت کی مے لایا "ح" نے حق کا جام پلایا

دوسری میم نے مست بنایا دال سے دل میں بشیر کے ان کی

یاد ہے صبح و شام

شہد سے بیٹھا محمد ﷺ نام

اس نعت میں اسم محمد ﷺ کے ایک ایک حرف کی برکت کا ذکر ہے۔ ثانی

صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایک شعر پر داد دی اور جھوم جھوم کے بار بار پڑھنے

کا تقاضا کیا۔

حافظ صاحب جب شرقپور شریف میں تشریف لاتے حضور ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ نعت ضرور ان سے سنتے اور آپ کے لئے بلندی درجات کی دعا فرماتے۔

اگست 1947ء میں جب پاکستان بنا تو حافظ صاحب اپنے خاندان کے ہمراہ اوکاڑہ میں آئے۔ بے کاری اور بے روزگاری کے باعث دن عسرت سے گزرنے لگے۔ چونکہ طبیعت میں انا تھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پسند نہ کیا۔ سٹیج کالٹن ملز کے برلا ہائی سکول میں ملازمت کی غرض سے گئے۔ انتظامیہ نے تعلیم کا پوچھا تو صرف آٹھ جماعت پاس کی تعلیم بتائی۔

اس پر اولاً ”انکار کر دیا گیا یہ انکار طبیعت پر گراں گذرا تصورات کی دنیا میں کھو گئے۔ حضور ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خیال دل میں لائے سر جھکا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ انتظامیہ کے لوگ دفتر سے نکلنے ہی والے تھے کہ ان میں ایک شخص نے کہا۔

نوجوان تھوڑی دیر کے لیے باہر رکو۔ آپ کو شاید دوبارہ بلایا جائے۔

حافظ صاحب باہر ایک گراسی پلاٹ (Grassi plot) میں بیٹھ گئے۔ ادھر

انتظامیہ میں گفتگو شروع ہوئی کہ۔

سنا گیا ہے یہ شخص نعت بڑے خوبصورت انداز میں پڑھتا ہے۔ بس نعت کا

آغاز کرتا ہے تو مجمع جھومنے لگتا ہے۔



مگر نعت خوان ہونا تعیناتی کی شرائط میں نہیں آتا۔ دوسرے شخص نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

صرف مڈل تک تعلیم اور پھر اس کے ثبوت میں کوئی سرٹیفکیٹ اور سند نہیں کیا خبر مڈل بھی پاس ہے یا نہیں۔ ایک تیسرے شخص نے بات بدھائی۔

آپ بجا فرماتے ہیں کاندھلوں کا پیٹ بھرنا ضروری ہے۔ مگر وہ تو مہاجر ہے مہاجرین تو وہ کچھ بھی بھارت میں چھوڑ آئے جو ان کے پاس تھا۔ سرٹیفکیٹ اور سند تو اسکول سے ملنا تھی۔ بھلا کیسے ساتھ لا سکتے تھے۔ پہلے شخص نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ مہاجرین کی مدد کرنا تو ویسے بھی ہمارا فرض بنتا ہے۔ حافظ قرآن ہے اسلامیات کے اسباق یقیناً بہتر طریقے سے پڑھا سکے گا۔ بچوں کی قرآنی تجوید درست کرائے گا۔ نعت مصطفیٰ ﷺ بچوں کو سکھا کر اچھے نعت خواں بنادے گا۔ اس طرح یہاں کے طلبہ میں اسلامی روح پیدا ہو سکے گی۔

اس شخص نے اس انداز سے حافظ صاحب کی حمایت میں گفتگو کی کہ انتظامیہ حافظ صاحب کی تعیناتی پر مجبور ہو گئی۔

حافظ صاحب کو دوبارہ بلایا گیا قرآن پاک کا ایک رکوع سنا پھر نعت مصطفیٰ ﷺ کی فرمائش ہوئی۔ حافظ صاحب نے وہی نعت ”شہد سے بیٹھا محمد ﷺ نام“ پڑھی تو انتظامیہ پر وجد طاری ہو گیا۔ نعت ختم ہوئی تو ساری سلیکشن کمیٹی حافظ صاحب کے حق میں بولنے لگی اس طرح اسی دن آپ کو تقرری کے احکام مل گئے۔ اسی روپے 80 ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ حافظ صاحب خوشی خوشی گھر

آئے۔

حافظ صاحب فرماتے ہیں یہ ان کے مرشد حضرت ثانی لاٹانی میاں غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرپوری کی توجہ کا اثر تھا۔ کہ مجھے یہ نوکری مل گئی۔  
حافظ صاحب کو سکول میں ایک سلجھا ہوا ماحول مل گیا۔ پڑھے لکھے اور پڑھنے لکھنے والے افراد کی ایک معقول تعداد مل گئی۔ آپ نے تبلیغ دین کا کام شروع کر دیا۔ ننھے ننھے بچوں کی زندگی کی بنیادیں اسلامی اینٹ گارے سے رکھنی شروع کر دیں۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے شیخ القرآن حضرت علامہ غلام علی صاحب قادری اوکاڑوی سے درس نظامی کی تعلیم بھی شروع کر دی۔ بلکہ اپنے اس استاد سے مل کر 1954ء میں جامعہ حنفیہ برکاتیہ اشرف المدارس کی بنیاد رکھی۔ آپ اس میں ایک مصروف طالب علم بھی تھے اور بانی رکن بھی (ازاں بعد اس کی سرپرستی بھی آپ فرماتے رہے)۔

1955ء میں برلاہائی سکول میں ایک چٹھی آئی جس کے مطابق سکول میں کام کرنے والے اساتذہ کی اسناد کی پڑتال ہونی تھی۔

حافظ صاحب کو بھی یہ چٹھی نوٹ کروائی گئی۔۔۔۔۔ حافظ صاحب کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی سند۔ نہ کوئی سرٹیفکیٹ۔ پڑتال کنندگان کو کیا دکھائیں گے؟ دل و دماغ میں پریشانی نے گھر کر لیا۔ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کیا جائے۔ عالم دین ہو کر بھی رزاق مطلق پر سے یقین ڈھیلا ہو رہا تھا۔ بار بار کہتے۔



80 روپے کے مشاہرے سے کافی حد تک ضروریات زندگی پوری ہو رہی تھیں۔ اب کیا بنے گا۔

اتوار کو سکول سے چھٹی تھی پس آپ گاڑی پر سوار ہوئے اور سیدھے شرقپور شریف میں قبلہ ثانی لاثانی حضرت میاں غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرقپوری اپنے پیرومرشد کے ہاں حاضر ہوئے۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسوقت گھروالی بیٹھک میں تشریف فرماتھے۔  
پوچھا حافظ صاحب خیر تو ہے۔

عرض کیا۔ حضور نوکری آپ کی توجہ سے ملی تھی اب وہ خطرے میں پڑ رہی

ہے۔

آخر کیوں؟

حضور حکومت کی طرف سے ایک چٹھی آئی ہے کہ سکول کے سارے اساتذہ کی سندیں چیک ہوں گی۔ چونکہ میرے پاس کوئی سند نہیں ہے لہذا چٹھی ہو جائے گی۔

کیا نوکری کے لیے سندیں ضروری ہوتی ہیں؟ نوکری اور چاکری کیلئے تو بس تابعداری چاہیے۔ جن لوگوں میں تابعداری نہیں ان کے پاس خواہ کتنی سندیں ہوں انہیں چھٹی مل سکتی ہے۔

مگر حضور! چونکہ گورنمنٹ کا وفد محض اس لیے آئے گا کہ ہماری سندیں دیکھی جائیں۔ اب فکر دامن گیر ہے کہ میں کیا دکھاؤں گا۔

تم انہیں نعت پڑھ کے سنا دینا۔ ہاں ہاں وہی نعت جو آپ نے نوکری حاصل کرتے وقت سنائی تھی۔ حضور ﷺ یقیناً آپ کی مدد فرمائیں گے۔

حافظ صاحب مزید کچھ نہ بول سکے مگر دل کی بے چینی جوں کی توں قائم رہی۔ حضور ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پہلو میں جگہ دے دی۔ فرمایا۔

آپ ایسا کریں۔ گھنگ شریف میں جائیں۔ بھائی رحمت علی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس مسئلے کو پیش کریں وہ آپ کو کوئی رستہ دکھائیں گے۔

اتنے میں کھانا آگیا دسترخوان بچھا اور دال چپاتی چن دی گئی۔ حافظ صاحب اور دیگر مہمانوں نے کھانا کھایا۔ پھر حافظ صاحب رخصت ہوئے اور سیدھے گھنگ شریف میں حاضری دی۔ حضور میاں رحمت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھتے ہی فرمایا۔

آئیے حافظ صاحب میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا وہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ والی نعت شہد سے بیٹھا محمد ﷺ نام سنائیں۔

حافظ صاحب اسی وقت دوزانو ہو کر بیٹھے اور شہد سے بیٹھا محمد ﷺ نام والی نعت شروع کر دی۔ حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک ایک شعر پر جھومتے رہے نعت ختم ہوئی تو فرمایا محمد شفیع دوبارہ سنائیں۔ حافظ صاحب نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ یہی نعت پڑھی۔

پھر میاں صاحب نے بازو سے پکڑا اور سینے سے لگا لیا۔ فرمایا آپ کرناوالہ



شریف میں جائیں وہ آپ کے لیے کوئی بندوبست کر رہے ہیں۔ (ابھی حافظ صاحب نے اپنی آمد کے بارے میں وضاحت بھی نہیں کی تھی)۔

حافظ صاحب شام کے قریب کرناوالہ میں غوث زمانہ، گنج کرم حضرت پیر سید محمد اسماعیل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پہنچے۔ شاہ صاحب قبلہ اس وقت مغرب کی نماز کے لیے وضو فرما رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اذان ہوئی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ صاحب سے فرمایا نماز آپ پڑھائیں نماز کے بعد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس نعت پاک کی فرمائش کی جو آپ نے گھنگ شریف میں پڑھی تھی یعنی شہد سے بیٹھا محمد نام! پھر آپ کو حجرے میں لیجایا گیا۔ کھانا پیش کیا اور پوچھا محمد شفیع وہ آپ کی نوکری والی کیا بات ہے؟

حافظ صاحب حیران ہوئے کہ میں نے تو ابھی آنے کا مقصد ہی ظاہر نہیں کیا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کیسے علم ہو گیا! بہر حال عرض کیا۔

حضور! میں برا سکول میں ہائی سکول میں شعبہ دینیات کا انچارج ہوں گورنمنٹ کیطرف سے ہماری اسناد چیک ہونی ہیں مگر چونکہ میرے پاس کوئی سند یا سرٹیفکیٹ نہیں ہے جعلی سند بھی نہیں ہے لہذا لازمی امر ہے کہ نکال دیا جاؤں گا۔

ہاں ہاں یہ خطرہ تو ہے مگر آپ کی تنخواہ کس قدر ہے۔

حضور۔ 80 روپے مشاہرہ ملتا ہے۔

صرف 80 روپے اتنے روپوں سے کیسے گذر ہوتی ہے۔

گذر تو اچھی ہو جاتی ہے۔

نہیں نہیں۔ 80 روپے بہت تھوڑے ہیں ہم آپ کو 380 روپے لے کر دیں گے۔ (خطیب پاکستان۔ اپنے معاصرین کی نظر میں یہ رقم۔ 400 لکھی گئی ہے)۔

یہ کیسے۔ 380 روپے تو ایم۔ اے پاس والوں کو نہیں مل رہے مجھے آٹھ جماعتیں پڑھے ہوئے کو کیسے ملیں گے؟

حافظ صاحب گھبرائیں نہیں۔ آپ کو نوکری سے نہیں نکالا جائے گا۔ جب بھی آپ جائیں گے اپنی مرضی سے جائیں گے اور یہ بھی غور سے سنیں۔ 380 روپے بہت جلدی آپ کو ملنے لگیں گے۔

حافظ صاحب اجازت پا کر گھر میں آگئے۔ اب یقین کی دولت سے ملا مل تھے کہ نوکری سے کوئی نکالے گا نہیں بلکہ خود چھوڑ کر جاؤں گا اور پھر مشاہرہ بھی۔ 380 روپے۔

بہر حال مقررہ تاریخ کو چیکنگ پارٹی آئی انہوں نے باری باری سب کی اسناد چیک کرنی شروع کر دیں۔

حافظ صاحب کو بلایا گیا تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ جسم و جان میں نقاہت آنے لگی۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ دوستوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیے اور طنزاً کہا۔

”جاؤ حافظ جی بھگوان بھلی کرے گا“۔ اپنی نعتوں کے ڈپلوے دکھا کر آئیں۔



حافظ صاحب کے چہرے پر خفت سی نمودار ہو گئی۔ آپ درود پاک کا ورد کرتے ہوئے بغیر کسی سند کے اس دفتر کی جانب چل دیئے جہاں سندیں چیک ہو رہی تھیں۔ کچھ بھی تو پاس نہیں تھا بس دل میں حضور قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک تصور تھا۔

ڈرتے ڈرتے جتن اٹھائی اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

حافظ صاحب کو دیکھتے ہی چیکنگ پارٹی کے سارے ممبران کھڑے ہو گئے۔

حافظ صاحب کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ وہ جن لوگوں سے خائف تھے انہیں کسی غیر مرنی قوت نے یوں احترام کرنے کیلئے کھڑا کر دیا ہے۔

سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ حافظ محمد شفیع صاحب اوکاڑوی ہیں ملک کے مانے ہوئے نعت خواں عالم دین اور حافظ قرآن، بہترین مقرر اور خطیب یہ شعبہ دینیات کے انچارج ہیں۔ نعت پڑھتے ہیں تو شجر و حجر پر ایک کیف کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

ماشاء اللہ حافظ صاحب ہمیں بھی آپ کوئی نعت سنائیں۔

حافظ صاحب اب خوف و ہراس کی حصار سے نکل چکے تھے۔ اولاً انہوں نے قرآن پاک کی تلاوت پیش کی اور پھر ”شہد سے بیٹھا محمد نام“ والی نعت کو نغموں میں ڈھالنا شروع کر دیا اور ایسا سماں بندھا کہ ہوش کی دنیا اٹھالی گئی بس کیف و سرور کی بارش برس رہی تھی خود رفتگی اور سپردگی کا عالم تھا کسی کو احساس تک نہ رہا کہ۔

”کس لیے آئے تھے یہاں کیا کر چلے“

حافظ صاحب کیلئے جو لمحے ایک کٹھن امتحان بنے ہوئے تھے وہ بوئے گل کی طرح نکشیں بکھیرتے گذر گئے۔ حافظ صاحب سے قطعاً ”کسی سند یا سرٹیفکیٹ کا مطالبہ نہ کیا گیا۔۔۔۔۔ حافظ صاحب اپنی پوسٹ پر پہلے کی طرح بحال رہے اور جو دن حافظ صاحب کو اپنی نوکری کا آخری دن لگ رہا تھا وہ بحالی کا دن بن گیا اور پہلے کی طرح حافظ صاحب کو سکول میں جاتے اور سکول سے آتے دیکھا گیا۔

تنخواہ والے دن حافظ صاحب تنخواہ لینے گئے تو پھر انہیں۔۔۔ 80 روپے ہی ملے سوچتے رہ گئے کہ دوسری باتوں کی طرح یہ بات کیوں پوری نہیں ہوئی؟

1956ء کے اوائل میں حافظ صاحب کراچی میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرنے کیلئے تشریف لے گئے۔ جلسہ کی انتظامیہ نے اپنے جلسے کی خوب تشریح کی تھی اتنے لوگ جمع تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حدنگاہ تک لوگ ہی لوگ تھے تین گھنٹے کا خطاب ہوا۔ لوگ جم کر بیٹھے رہے۔ محویت طاری رہی۔

صبح ہوئی تو میمن مسجد کی انتظامیہ نے آپ کے ناشتہ کی فرمائش کی جو قبول کر لی گئی۔ اس دوران میں انتظامیہ ملتی ہوئی اور مصر بھی کہ آپ ہماری مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دیں ہم آپ کو۔۔۔ 380 روپے ماہوار دیں گے۔

۔۔۔ 380 روپے کا عدد سنا تو حافظ صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ پھر فوراً ”کرمانوالہ والی نشست کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں اسی وقت اٹھے شکرانے کے نوافل ادا فرمائے پھر پیشکش کو قبول کر لیا گیا۔



کراچی میں تشریف لانے کے بعد آپ کی شہرت کی ساری راہیں کھل گئیں۔  
آپ طوطی پنجاب بنے، بلبل کراچی کہلوائے، مہر شریعت ثابت ہوئے، بدر طریقت  
بن کر فروزاں ہوئے اور خطیب پاکستان کے لقب سے سرفراز ہوئے۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اب دنیا کے شہنشاہیاں آپ کے قدموں پر نثار تھیں۔ ایوب خان آپ کے  
مشوروں کا طالب ہوا، ضیاء الحق آپ کے پہلو میں بیٹھا، بھٹو نے آپ سے معافہ  
کی۔ آپ واقعتاً ایک شہنشاہ تھے۔ خطابت کے شہنشاہ تھے۔ قلم کے بادشاہ  
تھے۔ صداقت میں منفرد تھے۔ عشق میں یکتا تھے۔ جرات میں نابغہ عصر تھے۔

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ حضرت قبلہ ثانی لاٹانی میاں غلام اللہ  
صاحب رحمۃ اللہ علیہ شرپوری کے حقیقی عقیدت مند تھے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے  
تھے کہ انہیں جو کچھ ملا وہ شرپور شریف کی ہستی کی بارگاہ سے ملا۔

حضرت قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی عقیدت اس واقعہ سے  
عیاں ہوتی ہے کہ۔

1953ء میں جب تحریک ختم نبوت نے زور پکڑا تو آپ کو بھی گرفتار کر لیا  
گیا اور سنٹرل جیل منٹگری (ساہیوال) میں نظر بند کر دیا گیا۔ آپ نے جیل میں  
حضور ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کی بیقراری کا اظہار کیا تو حضور رحمۃ  
اللہ علیہ خود ملنے کے لیے وہاں تشریف لے گئے اور پھر ابھی آپ جیل میں ہی تھے  
کہ آپ کا ایک بچہ تنویر احمد (عمر تین سال) قضائے الہی سے وفات پا گیا۔

حضور ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تعزیت نامہ لکھا اور فرمایا محمد شفیع گھبرائے نہیں ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ ایک ایسا ہی صدمہ آپ کو اور برداشت کرنا ہے۔

چنانچہ ایک ہی ہفتے کے بعد دوسرا بچہ منیر احمد (عمر ایک سال) بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ حضور ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا تعزیت نامہ لکھا۔

یہ دونوں تعزیت نامے حافظ صاحب نے زندگی بھر حرز جان بنائے رکھے اور اپنے بیٹے حضرت کوکب نورانی سے فرمایا کہ جب میں مرجاؤں تو دونوں خط میرے ہاتھوں میں دے کر دفن کرنا۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حافظ محمد شفیع اوکاڑوی کا وصال 24 اپریل 1984ء کو ہوا۔

روایت و مشاہدہ: محمد انور قمر شرقپوری۔ حضرت علامہ نور محمد نصرت نوشاہی صاحب۔ شیخ حکیم نیک محمد صاحب۔ شرقپور شریف۔

تصدیق واقعات: خطیب پاکستان اپنے معاصرین کی نظر میں۔ مطبوعہ دادا بھائی فاؤنڈیشن کراچی۔

ماہ نامہ نور اسلام نومبر 1993ء





## تعمیر مسجد کیلئے ایک روپیہ

- ☆ مسجد کا خادم برادری کا نمبر دار بن گیا۔
- ☆ مرد کال نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک روپیہ دے کر تعمیر کے ذرائع اور وسائل پیدا کر دیئے۔
- ☆ اللہ کی نعمتوں کو جھولی پھیلا کر لیا کرو۔
- ☆ اللہ خود اپنے گھر کی فکر کرے گا۔
- ☆ تعمیر مسجد کے لئے خرچ کا تخمینہ ٹھیک نہیں۔

کبڈی اور کشتی پنجاب کے دو دسی کھیل ہیں۔ جو نہی پنجاب کی ماؤں کے بیٹے اور بہنوں کے بھائی جوان اور گھرو ہوتے ہیں تو بغیر اس فن کو سیکھے میدان میں کود پڑتے ہیں ازاں بعد کچھ گھرو ان کھیلوں کی باقاعدہ تربیت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں کھیل دسی ہیں تاہم سارے جوانوں کے بس کا روگ نہیں ہوتا کہ وہ انہیں مستقل طور پر اپنائے رکھیں یہ پنجاب کی بعض خاص قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جٹ، زمیندار، اور ان کی مختلف گوتیں یعنی راجپوت، بھٹی، کھوکھر اور چیمے وغیرہ کے نوجوان بڑے شوق سے میدان میں آکر اپنی قوت اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں ہندو اور شیخ چونکہ نازک قومیں ہیں اس لیے ان گوتوں کے لوگ ایسے جوانوں کی حوصلہ افزائی تو خوب کرتے ہیں مگر میدان میں نہیں اترتے۔

آج سے کوئی 100 سال پیشتر شرقپور شریف کے نوجوان کبڈی میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے میلوں پر خوب مقابلہ بازی ہوتی تھی۔

ڈھول کی تھاپ کے ساتھ بھنگڑا ناچ اور جیتنے والوں کے جلوس نکلتے تھے۔ مٹی سے لبریز اور لنگوٹوں سے ملبوس یہ نوجوان ماؤں، بہنوں اور دوشیزاؤں کی آنکھوں کا تارا بن جاتے تھے۔

شرق پور شریف میں حضرت داؤد بندگی کے عرس مبارک میں شامل ہونے والے زائرین کی جماعت کا میلہ بڑی دھوم سے اس وقت سے اب تک لگتا ہے اس میلے پر بھی کبڈی کھیلی جاتی ہے۔

یہ 1966ء بکرمی کے بھادوں بمطابق مارچ 1909ء کی بات ہے جماعت کے میلے کی آمد آمد تھی کبڈی کھیلنے کے لئے ٹیمیں بنائی جا رہی تھیں کہ ایک سبزی فروش شیخ نے جس کا نام محمد حسین تھا کبڈی ٹیم میں اپنا نام لکھوا دیا۔ دوستوں نے کہا شیخ صاحب تم نے کبڈی کیا کھیلنی ہے بس تم تکرڑی (ترازو) کی بودی پکڑو یہ چٹی چڑی والے جوانوں کے بس کا روگ نہیں ہے کہ وہ دھرویس اور تلیاں برداشت کریں مگر یہ نوجوان نہیں مانا۔ منتیں کر کے اپنا نام لکھوا دیا۔ پھر صبح سویرے تیل کی مالش کر کے دوڑ ڈنڈ اور بیٹھکوں کی مشق کرنے لگا۔

25 پھاگن کی تاریخ آئی محلہ حکیم گڑھی میں شیخانے کھوہ کے کھیتوں میں کبڈی کا میدان بن گیا۔ ڈھول بجنے لگے اور میدان کے چاروں طرف لوگ ہی لوگ جمع ہو گئے کوٹ محمود اور اس کے گرد و نواح کے بانگے جیلے نوجوان ایک طرف تھے اور دوسری



طرف سے شرق پور شریف اور بھینی کے جیالے پھرتیاں دکھاتے ہوئے نکلے، انہیں جوانوں میں محمد حسین شیخ بھی تھا۔

کبڈی کا کھیل شروع ہوا کڑاک کڑاک طمانچوں کی آوازیں آنے لگیں۔ قینچیاں اور بٹھیاں ماری جانے لگیں کوئی گرتا، کوئی بھاگتا اس طرح جیتنے والا کھلاڑی اپنے ساتھیوں کے کندھے کا سوار بن جاتا۔ محمد حسین شیخ بار بار میدان میں کودنے کے لیے پر توڑتا مگر اسکے ساتھی اس کو روکتے رہے کہ آپ کبڈی کے لیے نہ جائیں۔ کھلاڑی بڑے غصے میں ہیں مقابلہ سخت ہے تم پہلی بار میدان میں آئے ہو تمہارا جسم بھی نازک ہے مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ اللہ کا نام لے کر آیا تیزی اور پھرتی کے ساتھ مخالف ٹیم کی صف چیر کر نکل گیا ایک نوجوان نے ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کی مگر اس نے تڑاک سے اس کی کمر میں ایک تلی ماری اور چھلانگ لگا کر نکل گیا وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔ مگر پکڑنے والے کھلاڑی نے ہمت ہار دی۔ ادھر محمد حسین زندہ باد ہو گئی دوسری بار پھر گیا اور اسی پھرتی کے ساتھ اب کے بھی نکل گیا، دوستوں نے اسے کندھے پر اٹھالیا محمد حسین زندہ باد چٹا کھلاڑی زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اب مخالف ”ٹیم کھار“ کھا گئی وہ اسے ہر حال میں شکست دے کر رسوا کرنا چاہتی تھی مگر جسے اللہ نے فتح دینی ہو اسے کون شکست دے سکتا ہے وہ جب بھی گیا فتح یاب ہو کے آیا کامیابی نے اس کے قدم چومے۔

چونکہ محمد حسین نے دوسرے کھلاڑیوں کی نسبت زیادہ پھرتیاں دکھائی تھیں ان پھرتیوں کو کوئے کی پھرتی سے تعبیر کیا گیا کہ جس طرح کوا ذرا سے اشارے سے بھاگ جاتا ہے ویسے ہی محمد حسین مخالفوں کے داؤ پیچ سے بچ نکلتا تھا چنانچہ ایک بار جب محمد



حسین کبڈی ڈالنے کے لیے گیا تو کسی نے کہہ دیا ”محمد حسین کاں“ کہنے والے نے یہ نام کسی بد نیتی سے نہیں لیا تھا اس کی تیزی اور پھرتی کے باعث کہا تھا مگر یہ نام مستقبل میں محمد حسین کے نام کا حصہ بن گیا اور اب اسے محمد حسین شیخ کی بجائے محمد حسین کاں کے نام سے جانا پہچانا جانے لگا۔ چنانچہ اب اس کے بیٹے پوتے اور نواسے سب ”کاں“ خاندان کے افراد کہلاتے ہیں۔ محمد حسین کاں نے کبڈی میں خوب نام کمایا جس ٹیم میں شامل ہوا وہ فتح سے ہمکنار ہوئی کئی سالوں تک وہ اپنی کبڈی ٹیم کا کپتان رہا۔ یہ سرداری اسے کبڈی کے میدان میں ملی۔ مگر جب وہ کبڈی سے ریٹائر ہوا تو شیخ برادری نے اس کی سرداری تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنا نمبردار بنا لیا اس کی بات اور اس کے فیصلے کا احترام کیا جاتا۔ شادی غمی کی رسومات اس کے آنے سے طے پاتیں برادری اور خاندانی جھگڑوں کے فیصلے صرف حاجی محمد حسین کاں کے حکم کے منتظر ہوتے۔

حاجی محمد حسین کاں ایک نیک اور صالح شخص تھا نمازی اور تہجد گزار تھا شرق پور شریف کی قدیمی مسجد ٹاہلی والی کا انتظام اس کے ہاتھوں میں تھا وہ منتظم اعلیٰ ہی نہیں تھا بلکہ مسجد کا خادم بھی تھا صفیں خود بچھاتا، جھاڑو سے صفائی خود کرتا، نمازیوں کے لیے پانی ڈول نکال نکال کر پانی کی سبیل خود بھر دیتا اس مسجد کو چونکہ شرقپور شریف کی قدیمی مسجد کا شرف حاصل ہے یا یوں سمجھیں جتنی عمر شرقپور شریف کی ہے اتنی ہی عمر اس مسجد کی ہے چونکہ اس کی بنیاد اور تعمیر میں نیک لوگوں کی نیتوں کا دخل تھا۔ اس لیے ان نیکوں کی یادگار قائم تھی۔

1952ء کی برسات کا موسم شروع ہوا تو مسجد کی چھت ٹپکنے لگی حاجی محمد حسین



مسجد میں تھا اس نے جلدی جلدی صفیں اکٹھی کر کے ایک کونے میں کھڑی کر دیں اور مٹی لے کر چھت پر چڑھ گیا چھت کا سوراخ بند کیا مگر جب واپس آنے لگا تو اس کپاؤں یکدم چھت میں دھنس گیا اور چھت میں ایک بڑا سوراخ بن گیا اب اس سوراخ پر کوئی پھٹی رکھی اور مٹی ڈال کر اسے بھی بند کیا۔

بوڑھا حاجی محمد حسین بارش سے بالکل بھیگ چکا تھا گھر جا کر کپڑے تبدیل کیے حاجی محمد حسین صاحب کو سردی ہو گئی رات کو بخار ہو گیا۔ آدھی رات گزری تھی کہ بارش ہونے لگی۔

حاجی صاحب کو فکر دامن گیر ہو گئی کہ نہ جانے چھت پھر ٹپکنے لگے مگر اللہ کا کرم رہا چھت نہیں ٹپکی تاہم حاجی صاحب اس فکر میں رہنے لگے کہ مسجد کی چھت اب کسی دن کی مہمان ہے۔ اس کی وجہ سے جانی نقصان بھی ہو سکتا ہے اگر اللہ کے کچھ بندے ہمت کریں تو مسجد نئے سرے سے تعمیر کر لی جائے مگر نفسا نفسی کا عالم تھا نمازیوں کی مالی حالت کوئی زیادہ مستحکم نہ تھی۔ بس چند روپے دینے والے تھے سینکڑے اور ہزار دینے والا کوئی نہ تھا۔ حاجی محمد حسین نے کئی لوگوں سے تذکرہ کیا۔ مگر اتنے لمبے چوڑے منصوبے کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

ایک دن صبح کی نماز پڑھنے کے بعد حاجی محمد حسین کاں حضور قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (میاں غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے ہاں بیٹھک میں چلے گئے۔ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ لوگ آتے رہے اپنا مقصد بیان کرتے دعا کرواتے اور چلے جاتے مگر حاجی محمد حسین بس بیٹھے ہی رہے آخر کوئی 9 بجے کے قریب بیٹھک میں صرف قبلہ

ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حاجی محمد حسین رہ گئے۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا محمد حسین بیٹھک کا دروازہ اندر سے بند کر دو۔ محمد حسین کال نے تعمیل ارشاد کی۔ پھر حضور نے محمد حسین کو اپنے پاس بٹھالیا اور پوچھا آج کیا بات ہے؟ اتنے پریشان کیوں ہو؟

محمد حسین کی آنکھوں میں آنسو آگئے بھرائی ہوئی آواز سے عرض کیا ٹائلی والی مسجد کی نئے سرے سے تعمیر کروانا چاہتا ہوں مگر ذرائع اور وسائل نظر نہیں آتے۔ محمد حسین! مسجد کس کا گھر ہے؟ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا۔ مسجد اللہ کا گھر ہے حاجی محمد حسین نے جواب دیا۔

جس طرح ہم تم اپنے گھر بناتے ہیں تو اس کے لیے ہمارے ہمسایوں کو کوئی فکر نہیں ہوتی ہمیں ہی ساری فکر ہوتی ہے ایسے ہی اللہ اپنا گھر بنالے گا فکر نہ کرو۔ فکر کیسے نہ کروں مسجد کی چھت گرنے والی ہے۔ عین ممکن ہے کوئی جانی نقصان ہو جائے۔

ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے اچھا کل خرچ کا تخمینہ آپ نے کیا لگایا ہے کوئی تخمینہ نہیں لگایا۔

مسجد کے لیے تخمینہ لگانا بھی نہیں چاہیے۔

ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روپیہ اپنی جیب سے نکالا۔ اسے اپنی جھولی میں رکھا فرمایا۔

محمد حسین! جھولی پھیلاؤ۔ پھر اپنی جھولی والا روپیہ محمد حسین کی جھولی میں ڈال دیا



کہا جاؤ اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دو۔ جو لوگ مسجد کے لیے چندہ دیں اسے بھی جھولی پھیلا کر لے لیں ہاتھ میں پکڑ کر نہ لیں اب جب یہاں سے جائیں تو سیدھے چوک تک جائیں پھر واپس مسجد میں آجائیں اور ہاں یہ شعر گنگناتے رہیں۔

يَا رَسُولَ اللَّهِ اُنْظُرْ حَالَنَا يَا حَبِيبَ اللَّهِ اِسْمَعْ قَالَنَا  
اِنِّي فِي بَحْرِ غَمٍّ مُّغْرَقٌ خُذِيْدِي سَهْلَ لَنَا اشْكَا لَنَا

محمد حسین نے عرض کیا حضور! مجھے یہ شعر کانڈ پر لکھ دیں۔

ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وقت یہ چاروں مصرعے کانڈ پر لکھ دیئے حاجی صاحب نے اس کانڈ کو پگڑی کے ایک کونے میں باندھ لیا پھر لوگوں سے ایک ایک لفظ کر کے یاد کر لیا یہ رباعی حاجی صاحب کا وظیفہ بن گئی وہ اٹھتے بیٹھتے اسے پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ مسجد کی پیشانی کی دیوار کی تیاری شروع ہوئی تو حاجی صاحب کی خواہش کے مطابق یہ رباعی بھی لکھی گئی۔

بہر حال حاجی محمد حسین کی جھولی میں صرف ایک روپیہ تھا اور دل کی جھولی میں طرح طرح کے بے شمار خیالات تھے ایک روپیہ سے کیا بنے گا۔ یہ تو مزدور کے ایک گھنٹے کا خرچ بھی نہیں ہے اینٹ، سریمینٹ کا کیا بنے گا محمد حسین کے دل میں ہر لمحے بے دلی جگہ پارہی تھی۔

آخر محمد حسین نے جانے کی اجازت طلب کی۔ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نہیں ابھی نہیں دروازہ کھول دو اور تھوڑی دیر کے لیے مزید بیٹھو۔

محمد حسین نے ابھی دروازہ کھولا ہی تھا کہ کوئی ملنے والا مہمان آیا۔ اس نے آتے ہی ایک سو روپیہ پیش کیا ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا محمد حسین یہ سو روپیہ بھی جھولی میں ڈال لو اور جاؤ اللہ کا نام لے کر کام شروع کرو۔ اللہ تعالیٰ بہت مسبب الاسباب ہے۔

محمد حسین حضور قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرمانے کے مطابق چوک تک چلتا گیا کئی لوگ ملے کہنے لگے سنا ہے ٹاہلی والی مسجد کی تعمیر ہونے لگی ہے یہ تھوڑا سا حصہ ہمارا بھی ڈال لیں حاجی صاحب نے نہیں دیکھا کوئی کیا دے رہا ہے اتنے میں شیخ محمد فقیر قصوریہ آیا اس نے دس ہزار روپیہ دیا شیخ محمد اسماعیل قصوریہ کہنے لگے مسجد کے لیے ساری اینٹیں میں دوں گا۔ کچھ لوگوں نے سرپا دینے کا وعدہ کیا۔

حاجی صاحب کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جس کام کو وہ بڑا مشکل خیال کر رہے تھے اس میں آسانیاں ہی آسانیاں پیدا ہوتی گئیں مسجد کی باقاعدہ تعمیراتی کمیٹی بنائی گئی اس کمیٹی میں زیادہ تر مسجد کی بزم غوثیہ کے فعال رکن تھے۔ یعنی

مولوی نور محمد نارگ	محمد امین نارگ
میاں محمد عاشق گولائیہ	لالہ محمد حفیظ کھرونہ
میاں محمد عاشق کھرونہ	محمد انور و ہینگڑہ (انور شاپ والے)
حاجی محمد اشرف کٹاریہ (حاجی بلہا)	

اولاً "ساری مسجد شہید کی گئی پھر نئے سرے سے اس کی دیواریں اٹھائی گئیں لینٹر ڈالا گیا۔ مینار بنائے گئے تیاری کی گئی فرش لگے مگر کام ایک دن بھی نہیں رک۔



مسجد کی تعمیر کا کام شروع رہا اور حاجی محمد حسین کل تقریباً "روزانہ ہی حضور قبلہ  
 ثانی صاحب (میاں غلام اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور کام کی  
 رفتار کے بارے میں رپورٹ دیتے رہے گاے گاے ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ بھی  
 مسجد میں تشریف لاتے۔ اور کام ہوتا دیکھ کر بڑے خوش ہوتے۔

حاجی محمد حسین کل بوڑھا اور کمزور ہو رہا تھا۔ مگر مسجد کی تکمیل اس کے جذبوں  
 کو جوان رکھے ہوئے تھی۔ اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اتنی خوشی شاید اسے اپنے  
 بیٹوں کی پیدائش پر بھی نہ ہوئی تھی جتنی خوشی اسے اس وقت ہوئی جب مسجد کا کام  
 مکمل ہوا اور راج مزدور اپنی مزدوریاں لے کر فارغ ہوئے۔ پھر اس کے رنگ و روغن  
 کی باری آئی اس کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی خزانوں سے کر دیا۔

تعمیراتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق تعمیراتی مسرل کے عطیات کے علاوہ  
 27000 روپے کے لگ بھگ کل خرچ آیا۔

حاجی صاحب کی اس مسجد سے بڑی محبت تھی بوڑھے ہونے کے باوجود مسجد کی  
 خدمت میں لگے رہتے۔ گرمیوں کا موسم آتا تو مسجد کا فرش ٹھنڈا کرنے کے لئے کئی با  
 لٹیاں پانی بہاتے جب آپ کے پوتے جوان ہو گئے تو وہ آپ کا ہاتھ بٹانے کو آتے مگر  
 آپ فرماتے بیٹا! یہ خدمت میرے سپرد رہنے دو۔ تم اپنے دنیا کے کام کرو مجھے کون سا  
 کام ہے مسجد کا فرش ہی تو ٹھنڈا کرنا ہے ٹھنڈا فرش ہو گا تو نمازی سکون سے نماز پڑھیں  
 گے کوئی پوتا اگر زبردستی بالٹی پکڑ لیتا تو آپ جھاڑو لے لیتے اور فرش کو دھونے لگتے۔

1970ء کا سال آگیا۔ حاجی صاحب مسجد کا فرش دھونے میں مشغول

تھے۔ بوڑھے کمزور بھی تھے بالٹی کا پانی بہانے لگے تو خود بھی بالٹی کے ساتھ لڑھک گئے ہر دے اور کولہ کی ہڈی ٹوٹ گئی درد اتنا شدید تھا کہ کراہنے لگے اس گیلے فرش پر کروٹیں بدلتے رہے۔ اور ہائے ہائے کرتے رہے۔

حاجی صاحب کے گرنے کی خبر آنا "فانا" بازار تک پھیل گئی۔ لوگ بھاگے آئے۔ بیٹے اور پوتے آئے گھر میں لے گئے علاج معالجہ ہوا۔ مگر بے سود مہینے تک صاحب فراش رہے اپنی نمازیں اشارے سے پڑھتے رہے۔ مسجد کا جو بھی نمازی آپ کی خبر لینے آتا اس سے مسجد کی صفائی و دھلائی کا ضرور پوچھتے۔ ایک دن بڑی حسرت سے کہا کاش میں اس دن مرجاتا جس دن گرا تھا کہ میرا غسل مسجد کے صحن کے پانی سے ہوتا مگر میری ایسی قسمت کہاں؟ یہ کہتے کہتے ان پر غشی طاری ہو گئی۔ نبضیں ڈوبنے لگیں پھر ہوش آیا تو کہنے لگے۔

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْظِرْ حَالَنَا يَا حَبِيْبَ اللّٰهِ اَسْمَعْ قَالَنَا  
اِنِّيْ فِيْ بَحْرِ غَمٍّ مُّغْرَقٍ خُذِيْدِيْ سَهْلًا لَّنَا اَشْكَآ لَنَا

اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر 85 سال تھی۔

(راوی میاں فضل کریم ابن حاجی محمد حسین کل)۔

ماہنامہ نور اسلام نومبر 1993ء



## ”اباجی“

☆ بیماری کا علاج تو محض ایک بہانہ ہے۔ شفاء منجانب اللہ ہوتی ہے۔

☆ لنگر کے ٹکڑے بیمار مویشیوں کا علاج بن گئے۔

☆ معالج کی شہرت اس کی ڈگریوں یا رجسٹریشن سے نہیں بلکہ اس کے کام اور اخلاص سے ہوتی ہے۔

☆ اس کی تمنا تھی کہ رات کو کوئی دکھی ہائے نہ کرے بس سکون سے سوئے اور سکون سے اٹھے۔

☆ دوائیں دی گئیں اور دعائیں لی گئیں۔

کوٹ رادھا کشن کے قریب بھائی پھیرو روڈ پر ایک قصبہ نما گاؤں نینکے میں 1976ء میں یہ خبر کانوں کان سفر کرتے کرتے آنا ”فانا“ پھیل گئی کہ ”اباجی“ وفات پا گئے۔ یہ خبر سنتے ہی لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ سب لوگوں نے اپنا کاروبار بند کر دیا۔ دکانوں کے شرگیٹ گرا دیئے گئے۔ اور پورے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔ بچے بھی اباجی کے سوگ میں بلبلا رہے تھے۔ جوان بھی مغموم تھے۔ عورتیں بھی رو رہی تھیں۔ سب ہائے اباجی، ہائے اباجی کہ رہے تھے۔ وہ شخص کتنا عظیم تھا! جسے پورے گاؤں کے لوگوں نے اباجی کا خطاب دے رکھا تھا۔

ہاں مرنے والے کو لوگ اباجی ہی کہتے تھے۔ وہ جوانوں کے بھی بوڑھوں کے بھی۔ بچوں کے بھی، عورتوں کے بھی اور مردوں کے بھی اباجی تھے۔ اور پورا گاؤں ان کی اولاد تھا۔ ہر دل میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ اتنی عمر کا بابا تھا کہ پورا گاؤں اس کے بیٹوں، پوتوں، پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہاں وہ 85 سال کا بوڑھا بابا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کئی بچے پیدا ہوئے اور جوان ہو کر بوڑھے ہو گئے۔ شاید اسی لئے لوگ انہیں اباجی کہتے تھے۔

لیکن نہیں یہ عمر کی بات نہ تھی۔ عمر میں تو اس سے بھی کئی زیادہ عمر کے بوڑھے بابے تھے مگر انہیں کوئی اباجی نہیں کہتا تھا۔ اس کے سینے میں ایک باپ کا دل دھڑکتا تھا۔ اس کے دل میں محبت کی دنیا آباد تھی۔ وہ دوسروں کے دکھ درد اپنے دامن میں ڈال لیتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا اور لوگوں نے اسے یہ خطاب دیا جس کے لیے لوگ عمر بھر ترستے رہتے ہیں۔ وہ خطاب تھا ”اباجی“۔

یہ اباجی! بابا حکیم جلال الدین تھے۔ بیماروں کے مسیحا، نبض دیکھ کے دوائی دیتے۔ نہ دوائی کے پیسے لیتے نہ کوئی انعام و اکرام کا لالچ۔ خیبر سے کراچی تک کے لوگ آتے۔ آپ کی دعا اور دوا سے صحت یاب ہوتے۔ ان کے مطب میں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ دوسرے حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس مریض جاتے ہی نہ تھے۔ وہ سارا دن بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے۔ سنا گیا ہے ایک حکیم نے حکمت چھوڑ کر پرچون کی دکان کر لی۔ پوچھا گیا حکیم صاحب یہ تنزیل کیوں؟



کہنے لگا۔ بابا جلال الدین سارے حکیموں ڈاکٹروں کو لے ڈوبے گا۔ وہ لوگوں کو مفت دوائی دیتا ہے۔ لوگ اتنے پاگل تو نہیں کہ ڈاکٹروں کی بھاری فیسیں بھریں اور مہنگی دوائیں خریدیں پھر صحت یابی کا بھی یقین نہیں۔ بابا جلال الدین نہ فیس لیتا ہے نہ دوائی کے پیسے لیتا ہے اور مریض کا اعتماد اور یقین بھی پختہ ہے کہ اسے صحت ہو جائے گی۔ پتہ نہیں یہ گھر کے اخراجات کیسے چلاتا ہے۔ تانبے، پارے، سونے اور چاندی کے قیمتی کشتے مفت بانٹے جا رہا ہے۔

ڈاکٹروں حکیموں نے طبی بورڈ قصور کے صدر سے شکایت کی بابا جلال الدین طبی لحاظ سے ایک ان پڑھ حکیم ہے۔ ویسے بھی یہ غیر رجسٹرڈ ہے۔ لوگوں کو کچے کشتے دیتا ہے جو صحت کی بجائے موت کا باعث بن سکتے ہیں۔

ان حاسدوں کی شکایت کی پذیرائی بڑی جلدی ہوئی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کا ایک بورڈ بھاگا آیا۔ قصور کا میڈیکل آفیسر بھی ان میں شامل تھا۔

نینکے میں آکر ان لوگوں نے جس بچے جو ان بوڑھے سے میاں جلال الدین کا پتہ پوچھا۔ سب نے بابا جی کے حوالے سے تعارف کرایا۔ یہ لوگ حیران رہ گئے کہ پورا گاؤں ان کی اولاد ہے۔ روحانی اولاد ہے۔ وہ ان لوگوں کے دلوں میں بستا ہے۔ اگر ہم سے بابا جی کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی، تو یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔ قدرتی طور پر ایک رعب سا ان لوگوں پر چھا گیا۔

بہر حال جب یہ وفد میاں جلال الدین کے مطب میں پہنچا تو کوئی 70 مریضوں کی دو لمبی قطاریں اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔



بابا جی کو اس وفد کی اطلاع دی گئی۔ تو انہیں کسی قسم کا کوئی تردد نہ ہوا۔ چارپائیوں پر ان لوگوں کو بٹھوا دیا گیا اور خود مریضوں کو دوائی دینے میں مصروف رہے۔ جب آپ اس کام سے فارغ ہوئے، تو ان مہمانوں سے فرمایا۔

اگرچہ مہمان کی بڑی تکریم ہے، مگر میں اس تکریم کا احساس کئے بغیر اپنے کام میں مصروف رہا ہوں۔ یقیناً "میری یہ حرکت آپ کو پسند نہیں آئی ہو گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے تندرست کی نسبت بیمار کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ آپ ماشاء اللہ خیریت سے ہیں۔ مگر بیمار بیچارے دکھوں کے مارے نہ جانے کس کس تکلیف میں مبتلا تھے۔ میں اس حرکت پر معذرت خواہ ہوں۔

اب ان کی شربت سے تواضع کی گئی۔ ازاں بعد پوچھا گیا کہ میرے غریب خانہ پر آپ نے کس غرض سے قدم رنجہ فرمایا ہے۔

ہمارے آنے کا مقصد یہ تحقیق کرنا ہے کہ کیا آپ رجسٹرڈ حکیم ہیں یا غیر رجسٹرڈ؟ بابا جی نے فرمایا! غیر رجسٹرڈ ہوں۔

کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں کہ حکومت غیر رجسٹرڈ حکماء کو مریضوں کی جانوں سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتی!

بابا جی نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ رجسٹرڈ حکماء مریضوں کی جانوں سے کھیل سکتے ہیں۔ گویا کہ اس طرح رجسٹریشن سے صرف حکیم کو تحفظ ملتا ہے کہ اگر اس کے زیر علاج مریض کی زندگی کی ڈوری کٹ جاتی ہے تو حکومت اس سے نہیں پوچھے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رجسٹریشن سے مریضوں کو کیا تحفظ ملا ہے؟



وفد کالیڈر چپ ہو گیا۔۔۔ باباجی نے فرمایا!

آپ مجھ سے امراض کی تشخیص کے بارے میں سوال کریں۔ ان امراض کی دواؤں کے بارے میں سوال کریں۔ اگر میں آپ کو مطمئن نہ کر سکوں، تو مجھے بے شک علاج معالجے سے روک دیا جائے، ویسے بھی آپ خوب جانتے ہیں کہ حکیم کی شہرت اس کی ڈگریوں یا رجسٹریشن سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے کام کے اخلاص سے ہوتی ہے۔ اس کے علاج سے صحت یاب ہونے والے مریض خود بخود اس کی شہرت کا اشتہار بن جاتے ہیں۔

وفد نے باباجی سے سر درد کی وجوہات دریافت کیں۔ درد گردہ کے بارے میں بھی سوالات کئے۔ باباجی نے انہیں تسلی بخش جواب دیئے۔ وفد کے ہر ممبر نے اپنی ہستی کی اہمیت جتانے کے لیے سوالوں کی بھرمار کر دی۔۔۔۔۔ باباجی ہر ایک کو مطمئن کرتے رہے۔ آخر میں آپ نے فرمایا کیا میں بھی آپ سے کوئی سوال کر سکتا ہوں؟ وفد کے لیڈر نے عرض کیا نہیں۔ ممتحن صرف امتحان لے سکتا ہے۔ امتحان دیا نہیں کرتا۔

لیڈر کو شاید علم ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی یقیناً "باباجی کے سوالوں کے جوابات نہیں دے سکیں گے۔ انہوں نے گفتگو کا رخ بدلا۔ اور ان کے مطب کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

انشائے گفتگو وفد نے پوچھا کہ آپ نے حکمت کس سے سیکھی ہے؟

باباجی نے فرمایا۔ کیا حکمت سیکھنے والی کوئی چیز ہے؟ حکمت تو خدا کی دین ہے،

جسے چاہے وہ دیدے۔

ہمارا مطلب حکمت . معنی دانائی نہیں بلکہ حکمت . معنی علاج مریضوں ہے یعنی

طب۔

”بس میری تمنا تھی کہ کوئی دکھی انسان رات کو ہائے نہ کرے۔ سکون کے ساتھ سوئے اور سکون کے ساتھ اٹھے۔ میں نے حکمت کی کچھ کتابیں خریدیں اور معمولی قسم کی دوائیاں بنا کر لوگوں کو دینے لگا۔ چونکہ میری نیت اور جذبہ میں خلوص تھا اس لیے قدم قدم پر میری پذیرائی ہوئی۔ اب میں چاہتا تھا کہ بڑے امراض کا بھی علاج کروں مگر ڈرتا تھا کہ کہیں نیم حکیم خطرہ جان والا معاملہ نہ بن جائے۔“

”میں چونکہ شرق پور شریف میں اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے برادر حقیقی حضرت میاں غلام اللہ صاحب ، ثانی لاٹانی رحمۃ اللہ علیہ کی غلامی میں اپنے آپ کو دے چکا تھا۔ چاہتا تھا کہ اپنے پیرومرشد کے آگے اپنی تمنا کا اظہار کروں۔ مگر جرات نہ ہوتی تھی۔ غالباً 1935ء کی بات ہے۔ تمناؤں اور آرزوؤں کے غنچے خود ہی پھول بن کر کھلنے کو بے قرار ہو گئے۔ میں حضور قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، کچھ تنہائی ملی، تو ثانی صاحب خود ہی فرمانے لگے۔“

جلال الدین آج کیا بات ہے۔ اس قدر کیوں سہمے بیٹھے ہو؟

میں نے عرض کیا۔ حضور آپ جانتے ہیں میں حکمت کی دکان کرتا ہوں مگر کچھ

مریض آس لے کر آتے ہیں۔ مگر میں انہیں نامراد واپس بھیج دیتا ہوں۔

کیوں؟ تم ان کا علاج کیوں نہیں کرتے؟



کیونکہ ان کے امراض پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاج بڑے بڑے حکماء کے پاس ہوتے ہیں۔

دیکھو جلال الدین علاج تو محض ایک بہانہ ہے، شفاء تو اللہ تعالیٰ نے دینی ہوتی ہے۔ مریض آئے تو شرمایا نہ کرو۔ اپنے حساب کی دوا اسے دیدو۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ شفاء پائے گا۔

اس دن سے حکمت کی کتابوں میں جن مرضوں کے لیے جو دوائیاں لکھی ہوتی ہیں میں انہیں استعمال میں لا رہا ہوں۔ جس کو دوائیں دیتا ہوں اس سے دعائیں لیتا ہوں۔

وفد نے جب بابا جلال الدین کی یہ باتیں سنیں تو دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے۔ آپ کی حکمت کا انداز بالکل مختلف ہے۔ آپ کے پیچھے واقعتاً اس ولی کامل کا ہاتھ ہے جس کی آپ غلامی میں ہیں جب تک ان کی نگاہ آپ کے حال پر ہے یہ فیض جاری رہے گا۔

وفد چلا گیا۔ اس نے نہ جانے کس طرح کی رپورٹ تیار کی مگر بابا جلال الدین کو اس کے بعد کسی نے نہیں پوچھا۔

اب ایک دن ایسا آیا۔ بابا جلال الدین کے پاس ایک شخص آیا کہنے لگا۔ باباجی! میری بھینس بیمار ہو گئی ہے، اس کے لیے بھی کوئی دوائی عنایت فرمائیں۔ باباجی نے فرمایا۔ کل آنا۔

باباجی مطب سے فارغ ہو کر سیدھے شرق پور شریف میں آ گئے۔ حضور قبلہ

ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملے۔ عرض کیا حضور! اب تو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے مویشیوں کا علاج بھی کریں۔ میں ایک بندے سے کل کے لیے وعدہ کر آیا ہوں۔

حضور میاں صاحب نے بابا جلال الدین کو لنگر کھانے کو دیا۔ لنگر کے کچھ ٹکڑے بچ گئے۔ فرمایا جلال الدین یہی ٹکڑے اس بھینس کو کھلا دو۔

بابا جلال الدین یہ ٹکڑے لے کر چلا گیا۔ وعدے کے مطابق وہ شخص آیا۔ عرض کیا۔ حضور! میری بھینس کو بڑی تکلیف ہے اگر آج آپ نے دوائی نہ دی تو بیچاری مر جائے گی۔ میں غریب آدمی ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ دودھ کی پیالی پی لیتے ہیں۔ میں تو کل کا ڈرا ہوا ہوں۔

باباجی نے آستانہ عالیہ شرق پور شریف کے لنگر کا ایک ٹکڑا دیا۔ فرمایا جاؤ اسے کھلاؤ۔ اور ظہر کے بعد آکر مجھ سے ضرور ملنا۔

عصر کے قریب وہ شخص آیا تو بڑا خوش تھا۔ کہنے لگا اس کی بھینس بالکل ٹھیک ہے۔

ولی کامل کے لنگر کا ٹکڑا بھینس کا درست ہو جانا ایک خاص وقت کی کرامت کی بات تھی۔ مگر بابا جلال الدین نے مویشیوں کے مرض کے لیے علاج حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لنگر کے ٹکڑوں کو سمجھا۔ وہ جب بھی شرق پور شریف میں آتا لنگر کے بچے کھچے ٹکڑوں سے تھیلا بھر کے لے آتا، اور حاجت مندوں کو دے دیتا۔ دو طرفہ یقین کی بات تھی ہر بھینس، گائے، گھوڑی، گھوڑے، بکری، بکرے، کو لنگر کے ٹکڑے کھانے سے صحت ہو جاتی۔



کیا یہ تاثیر لنگر کے ٹکڑوں سے اب ختم ہو گئی ہے؟ نہیں حضرت قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ بابا جلال الدین وفات پا گیا۔ اس کی حکمت ختم ہو گئی اس کا مطب بند ہو گیا۔ مگر لنگر کے ٹکڑوں کی تاثیر اب بھی موجود ہے۔ اب بھی اس گھر میں یہ ٹکڑے تھیلوں میں بھر بھر کے جارہے ہیں اور لوگ ان سے فیض پارہے ہیں۔

انہیں بابا جلال الدین سے متعلق ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے کہ جن عورتوں کے ہاں بچے پیدا نہیں ہوتے تھے۔ وہ بھی آنے لگیں۔ بابا جی نے انہیں بھی تسلی کی خاطر دوائی دینی شروع کر دی مگر ایسی عورتوں کو فائدہ نہ ہوا۔ وہ بچوں سے محروم رہیں۔ ان کی گودیں خالی رہیں۔ بابا جی بڑے متفکر ہوئے۔

بارگاہ خداوندی میں گزر گزرتے رہتے۔ عرض کرتے بار الہا! بابا جلال الدین کے دروازے سے ایسی عورتوں کو کیوں محرومی ہوتی ہے؟

آخر ایک دن یہ تمنا بھی لے کر بابا جی حضرت قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حاضر ہوئے چہرے پر سے بشارت غائب تھی، آنکھوں میں انکساری تھی، زبان پر التجائیں جلوہ گر تھیں اور دل میں نہ جانے کون کون سی تمنائیں بات بن جانے کو بے قرار تھیں۔

حضور ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جلال الدین اب آپ کا مطب کیسے چل رہا ہے؟

الحمد للہ آپ کی دعاؤں سے ٹھیک طرح سے چل رہا ہے۔

اب تو مریضوں کو کوئی مایوسی نہیں ہوتی۔

نہیں حضور آپ کا فیض جاری ہے۔

میرا فیض جاری ہے! وہ کیسے؟ کام تو آپ کرتے ہیں۔ فیض آپ دیتے ہیں۔

مریض آپ دیکھتے ہیں۔ دوائی آپ دیتے ہیں۔ ناموری اور شہرت آپ کی ہوتی ہے۔  
لوگ تو آپ کے فیض کو تسلیم کر رہے ہیں۔

حضور! وہ ان کی بات ہے مگر میری بات یہ ہے کہ سارا فیض آپ کا ہے۔

ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ مسکرائے۔ فرمایا۔ جیسا بھی ہے اسے جاری

رکھو۔ حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ایک پھول دیا اور فرمانے لگے۔

جلال الدین دیکھو یہ پھول ریاض مدینہ کا پھول ہے۔ رحمت للعالمین کے شہر کا پھول

ہے۔ اس پھول کا نام کچھ لوگ گل مریم لیتے ہیں۔ یہ لے جاؤ۔ اسے اپنے کام میں لاؤ۔

پانی جس میں ہم نے پھول رکھا ہے، اس پھول کی بند پتیوں کو کھولنے میں مدد دی

ہے۔ پھول نے اس کے بدلے میں اس پانی میں وہ تاثیر دی ہے، جو عورت اسے پی لے

گی اس کی گود میں پھولوں جیسے بچے اللہ تعالیٰ دے گا۔ واقعتاً اس پھول نے اس طرح

اپنی تاثیر دکھائی جیسے حضرت قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

راوی ○ بابا عبدالغفور ابن حکیم بابا جلال الدین عرف ”ابا جی“

ماہ نامہ نور اسلام شرقپور شریف جنوری 1995ء



## معالج

- ☆ اللہ والے اللہ والوں کے ہاں جانا اپنی زندگی کا معمول بنا لیتے ہیں۔
- ☆ مردان کا طین اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر اپنی آنکھوں کا وضو کیا کرتے ہیں۔
- ☆ اللہ والے بیماری کی حالت میں ہائے وائے نہیں کرتے۔
- ☆ ولی اللہ کی شہرت پھولوں کی طرح گرد و نواح میں پھیل جاتی ہیں۔

غالباً" یہ 1955ء کی بات ہے کہ میرے والد محترم حاجی محمد شریف رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایک بورڈ (2 x 5) لکھنے کے لیے فرمایا۔ جس کی عبارت اس طرح سے تھی۔

"یہاں پر ہر ماہ چاند کی چودہ تاریخ کو گیارہویں شریف کا ختم ہوتا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد آستانہ شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ پر حاضری کی غرض سے جو گیا تو یہ بورڈ اعلیٰ حضرت کے دربار اقدس کی غربی جانب نئے تعمیر ہونے والے ہال کے ایک کونے پر آویزاں تھا۔ یہ بورڈ کس انجمن کی طرف سے یا کس شخصیت کی طرف سے آویزاں کرایا گیا تھا۔ میں اس سے نا آشنا تھا۔ چاند کی چودہویں تاریخ کی شب کو پتہ چلا کہ اس گیارہویں شریف کی محفل کا انعقاد حضرت فضل الہی صاحب مونگہ کے اہتمام سے ہوتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے حاضرین و سامعین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ محفل اب تک باقاعدگی کے ساتھ انعقاد پذیر ہو رہی ہے۔ اب اس محفل کا

اہتمام جناب حاجی فضل احمد صاحب مونگہ (ابن حاجی فضل الہی رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں مزید برآں اب یہ محفل دربار پر نہیں بلکہ حاجی صاحب کے گھر میں ہوتی ہے۔

بہر حال جب یہ محفل دربار اعلیٰ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر منعقد ہوتی تھی اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی چنانچہ ایک بار اس محفل میں ایک ایسی ہستی نے شرکت فرمائی جنہیں حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

یہ تھے جناب ڈاکٹر سید دلاور علی شاہ صاحب، ان کا تعلق جناب فضل الہی صاحب سے کافی مدت پیشتر سے تھا آپ نے اس محفل کے کیف و سرور سے خاص لطف اٹھایا اور اس میں شمولیت کو اپنے لیے ایک سعادت سے کم نہ سمجھا۔

اس حاضری نے حاجی صاحب کے صاحبزادے جناب حاجی فضل احمد صاحب مونگہ سے ایک تعلق اور گہرا ربط قائم کیا جو مزید ملاقاتوں کا باعث بنا اور آشنائی کے نقوش دلوں میں مزید گہرے ہوتے چلے گئے اور دونوں طرف سے ادب و احترام کے دامن مضبوطی سے تھام لیے گئے اس تعلق کا پتہ اس وقت چلا جب حضور قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس مرض میں مبتلا ہوئے جو آپ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کا باعث بنا۔

ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ کو شوگر کی تکلیف تھی۔ جس کے باعث آپ کے دونوں گردے بری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ کھانسی اور بخار نے آپ کی خدمت میں مستقل طور حاضر رہنا شروع کر دیا اس طرح جسم کی توانائیاں سلب ہونے لگیں



کمزوری اور تکلیف حد سے بڑھنے لگی۔

ایک دن صاحبزادہ حضرت محمد عمر بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز اعلیٰ حضرت شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ آپ حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلام عرض کیا۔ وعلیکم السلام کی آواز اتنی مدہم تھی کہ صاحبزادہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسے سن نہ سکے۔ اس لیے آپ ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو فرمایا۔ مگر آپ زیادہ نہیں بیٹھے۔ فوراً اٹھے۔

حاجی شاہ محمد رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حاجی فضل احمد صاحب موہنی روڈ والے ایڈیٹر ”سلسبیل“ دونوں کو بلایا۔ فرمایا۔ آپ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ جلدی کریں اور حاجی فضل الہی صاحب مونگہ کو اس صورتحال سے آگاہ کریں۔

وفا کے ان پتلوں نے حاجی صاحب کے ہاں جانے میں کسی قسم کی تاخیر نہیں کی۔ حاجی صاحب، ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حضور آنے ہی والے تھے۔ گھر سے نکلے تو ان دونوں کو اپنی جانب تیز قدموں سے آتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہروں پر پریشانی کی دنیا آباد تھی۔ حاجی صاحب وہیں رک گئے۔ پوچھا خیریت تو ہے۔ حاجی فضل احمد (سلسبیل والے) آگے بڑھے۔ ان کی آنکھیں برس پڑیں۔ عرض کی۔ حضور قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حالت زیادہ تشویش ناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی صحبت سے مزید کچھ عرصہ فیض یاب ہوتے رہیں۔ تو جو کچھ آپ



کر سکتے ہیں کریں۔ حضرت قبلہ بیربلوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہی پیغام دے کر ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔

ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ کا علاج ان دنوں ملک کے معروف معالج حکیم آغا دوست محمد صاحب تکمیلی کر رہے تھے جو طبیبہ کلج لاہور کے پرنسپل تھے۔ یہ نامور حکیم حضرت پیر طریقت صابزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری کے طب میں استاد بھی تھے۔ اس نازک وقت میں فوری طور پر انہیں اطلاع دینا ضروری خیال کیا گیا۔ حاجی فضل احمد صاحب (ابن حاجی فضل الہی و مصنف حدیث دلبراں) نے فوراً لاہور رحمان ٹرانسپورٹ کمپنی کی ایک گاڑی کا انتظام کیا اور یہ تینوں صاحب لاہور کی جانب چل دیئے۔ گاڑی کو شیخ غلام محمد نارگ پوری احتیاط اور ہوش مندی سے بھگانے لگا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے، جب یہ مختصر سا قافلہ حکیم صاحب (آغا دوست محمد تکمیلی) کے ہاں پہنچا۔ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ کی تشویشناک صورت کے بارے میں بالوضاحت بتایا گیا اور ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ حاجی فضل الہی صاحب مونگہ نے خصوصی طور پر فرمایا ہے کہ آپ ان آنے والوں کی باتیں سن کر کوئی نتیجہ اخذ نہ کریں اور نہ ہی کوئی دوائی تجویز کریں بلکہ فوراً شرقپور شریف میں تشریف لائیں اور حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خود آکر دیکھیں۔

حکیم صاحب دن بھر کے کام سے تھکے ہوئے تھے۔ آرام کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ پیغام کسی معمولی شخصیت کے بارے میں نہ تھا کہ ٹل دیا جائے حضرت قبلہ ثانی صاحب



رحمتہ اللہ علیہ مثلِ نَحْشِ نقشبندیہ میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ ان کی گرتی ہوئی صحت سے پوری دنیائے نقشبندیہ متاثر ہو سکتی تھی۔

آپ نے آرام اور مصروفیات کو ایک طرف کر دیا اور فوراً "ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ پھر سب کو بیٹھ جانے کو فرمایا پنسل منہ میں لے کر گہری سوج میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے۔

اگر ہو سکے تو ڈاکٹر سید دلاور علی شاہ صاحب کو ساتھ لے لیں۔ مگر وہ جانے والے نہیں ہیں وہ تو خود دنیوی اور روحانی طور پر ایک ارفع مقام رکھتے ہیں۔ رات کو اور گھر سے اتنی دور جانے پر وہ کبھی بھی رضامند نہ ہونگے۔ کاش مجھے اس وقت کوئی ایسا نام یاد آجائے جن کا کہا وہ ٹال نہ سکیں۔

گھڑی رات کے گیارہ بج رہی ہے اور ابھی مزید دو گھنٹے تک اپنے مطب میں مشغول رہیں گے۔ شاید وہ ہمارے ہمراہ جانے سے انکار کر دیں۔ ان کا انکار ہمارے لیے ایک دھچکا سے کم نہ ہو گا۔

حاجی فضل احمد صاحب آگے بڑھے اگر ان کا جانا حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے مفید ہے تو ہم انہیں ہر قیمت پر لے جائیں گے۔

مسئلہ قیمت کا نہیں، مسئلہ ان کے مان جانے کا ہے۔ معمولی آشنائی انہیں لے جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔

کوئی بات نہیں آشنائی تو ان سے معمولی سی ہے مگر امید ہے وہ ہماری خواہش کو ٹھکرائیں گے نہیں۔

کاش آپ کا گمان سچ ثابت ہو۔

حکیم صاحب کو ساتھ لے کر یہ لوگ گاڑی میں بیٹھے اور بغیر کسی قسم کی دیر کئے چونا منڈی میں جناب سید ڈاکٹر دلاور علی شاہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا مطب چل رہا تھا۔ لوگ اپنے مریضوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نبضیں دیکھ رہے تھے۔ اسٹیٹھو سکوپ لگا لگا کر دل کی دھڑکن کا جائزہ لے رہے تھے۔ بلڈ پریشر چیک کر رہے تھے۔ مشورے اور نسخے دیئے جارہے تھے۔ گویا کہ ڈاکٹر صاحب اس قدر مصروف تھے کہ سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے جونہی حاجی فضل احمد کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ نصف رات وہ شخص آجائے گا جس کی محبت کے نقوش مدت سے دل میں مرتسم تھے۔ محبت کے تقاضے مجبور کرتے ہیں کہ ملنے کے بہانے تلاش کئے جائیں، ملیں اور دوبارہ ملنے کی آرزو لے کر جدا ہوں۔ اور اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ ایسی ملاقات میں دونوں میں سے کس کو زیادہ مسرت ہوتی ہے۔

اکثر لوگوں کے ہاں ہمارا آنا جانا مختلف مقاصد کا حامل ہوتا ہے۔ مگر ڈاکٹر کے پاس کوئی شخص جاتا ہے تو وہ یا بیمار بن کر جاتا ہے یا بیمار کی خاطر۔ اس لیے ڈاکٹر آنے والے کے بارے میں وقت سے پہلے جان لیتا ہے کہ وہ کیوں آیا ہے البتہ جب اس کے ہاں کوئی اس کے تعلق والا آتا ہے تو وہ حیران ہو کر ضرور پوچھتا ہے کہ کیوں کیا بات ہے خیریت تو ہے اسے بڑی تشویش ہوتی ہے کہ اس کے تعلق والا کیوں بیمار بن گیا ہے۔

یہی معاملہ یہاں حاجی صاحب کے ساتھ پیش آیا۔



ڈاکٹر صاحب اٹھے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک یہ حضرات کلینک میں نہ بھی کرسیوں پر بیٹھ نہیں گئے۔ پوچھا خیریت تو ہے۔ رات کے اس حصے میں اتنی مسافت طے کرنے کے دامن میں کیا پوشیدہ ہے کہیں آپ کے ابو (حاجی فضل الہی صاحب) کی طبیعت تو ناساز نہیں۔

نہیں والد صاحب تو ماشاء اللہ خیریت سے ہیں مگر وہ خیریت سے نہیں جن کی خیریت ہم سب چاہتے ہیں۔ حضرت قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک عرصے سے بیمار ہیں اب ان کی بیماری تشویشناک صورت اختیار کر گئی ہے۔ والد صاحب نے ہی مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور حضرت صاحب کی صحت کے لیے جو کچھ آپ کر سکتے ہیں کریں۔

ڈاکٹر صاحب نے مریضوں سے معذرت کرتے ہوئے کلینک کو بند کرنے کا حکم فرمایا اور اسی حالت میں میڈیکل ایڈ بکس پکڑا اور ساتھ چل دیئے۔ راستے میں حکیم نیر واسطی صاحب کو بھی ہمراہ لے لیا۔ اتفاق سے اس وقت حکیم نیر واسطی صاحب کے ہاں ان کے ایک خاص دوست جو معروف حکیم تھے، راولپنڈی سے تشریف لائے ہوئے تھے وہ بھی اپنی پیرانہ سالی کے باوجود ساتھ چل دیئے۔ گاڑی میں بیٹھے تو فرمایا اگر آپ برانہ منائیں تو میں حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضری دے لوں۔

ڈاکٹر صاحب ہر روز داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حضور حاضری دینے جاتے ہیں۔ نوکر کو پھولوں کے ہار دے کر بھیج دیتے مگر خود گاڑی میں ہی بیٹھے بیٹھے دعا مانگتے لگتے ہیں۔ دعا مانگنے کے دوران میں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں مگر آج



معمول کے خلاف آپ بارگاہ ہجویری رحمۃ اللہ علیہ میں حاضر ہوئے۔ روضہ اقدس کی جالیوں کو چوم کے چوکھٹ پر سر رکھ دیا۔ رونا شروع کر دیا۔ پھر دعا مانگی اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شرقپور شریف کی طرف چل دیئے۔

ادھر انتظار کی گھڑیاں لمبی ہو رہی تھیں۔ ملکانہ دروازہ میں انتظار کرنے والوں کا ایک عظیم ہجوم بے قرار و مضطرب تھا۔ وہ جونہی کسی گاڑی کی روشن بتیوں کو شہر کی جانب آتے دیکھتے تو انہیں یہ گمان گزرتا کہ کوئی ڈاکٹر یا حکیم ضرور اس گاڑی میں ہو گا مگر وہ گاڑی جب قریب آتی تو نتیجہ ان کی امیدوں کے خلاف نکلتا۔

آخر وہ گاڑی بھی آگئی جس کا انتظار اس بے قرار ہجوم کو تھا۔ صاحبزادگان حضرت میاں غلام احمد صاحب اور حضرت میاں جمیل احمد صاحب اور صاحبزادہ حضرت محمد عمر بیربلوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ (حضور ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس تھے اور انتظار کرنے والوں میں حاجی فضل الہی صاحب مونگہ پیش پیش تھے۔ وہ ماہی بے آب کی طرح بے قرار تھے۔ انہیں کسی پل سکون نہیں تھا وہ کبھی حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جاتے اور کبھی اس ہجوم میں آ جاتے۔

گاڑی رکی تو ڈاکٹر صاحب (سید دلاور علی شاہ) سب سے پہلے گاڑی سے باہر نکلے۔ حاجی فضل الہی نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے دیئے گھر کی طرف جانے لگے تو سب سے آگے ڈاکٹر صاحب تھے۔ ان کے پیچھے حاجی فضل الہی مونگہ ان کے پیچھے حکیم نیرواسطی اور حکیم آغا دوست محمد صاحب تکمیلی اور راولپنڈی سے آئے ہوئے حکیم صاحب تھے۔



بیٹھک کے دروازے پر صاحبزادگان ان حضرات کا انتظار کر رہے تھے۔ دیکھا تو آگے بڑھ کر ان معزز حضرات سے مصافحہ کیا۔ حضرت بیربلوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیٹھک میں چلے گئے۔ ڈاکٹر سید دلاور علی شاہ صاحب جو نئی دروازے پر پہنچے تو بے ساختہ اپنا سر چوکھٹ پر رکھ دیا منہ سے اسے چوما پھر باری باری آنکھوں پر بوسہ دیا۔ عرض کیا۔

یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے مجھے اس چوکھٹ پر دوبارہ سر رکھنے کی سعادت بخشی ہے ورنہ یہ کتنا کس قلیل تھا کہ اس دولت سنگ آستان بوسی سے مستفید ہوتا۔

ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ بیماری کے درد و کرب تو برداشت کئے خاموشیوں کی چارپائی پر لیٹے تھے۔ ان کی آنکھیں ہر آنے والے کو دیکھ رہی تھیں مگر چپ تھے۔ دنیائے عقیدت کا محبوب بیمار پڑا تھا۔ ایک پورامیڈیکل بورڈ اس کے گرد جمع تھا۔ کوئی نبض دیکھ رہا تھا کوئی آنکھوں کے پوٹے پرت پرت کر دیکھ رہا تھا۔ کسی نے سینے پر اسٹیتھو سکوپ رکھی ہوئی تھی اور اپنی دانست کے مطابق نتائج مرتب کر رہا تھا۔ آخر اس بات کا فیصلہ ہوا کہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبلہ کو لاہور لے جانا چاہیے۔ یہاں کی نسبت وہاں طبی سہولتیں زیادہ ہیں اور جلدی دستیاب ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے ایک انجکشن لگایا جس نے طبیعت کی بے چینیوں میں سکون پیدا کیا حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سکون کے ساتھ سو گئے۔ (ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لاہور نہیں لے جایا گیا)۔

یہ ڈاکٹر اور حکیم بیٹھک میں آگئے۔ کسی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت



کیا کہ آپ نے شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ کی چوکھٹ پر سر رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے اس چوکھٹ پر دوبارہ سر رکھنے کی سعادت بخشی ہے۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پہلی بار آپ کب اور کیوں تشریف لائے تھے۔ یہ ایک راز ہے اگر نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔

راز تو بے شک ہے اور اگر اسے افشاء کیا گیا تو یقیناً "کئی لوگوں کو ایمان کی تازگی مل سکے گی۔"

بہتر ہو گا اس بارے میں آپ حاجی فضل الہی مونگہ صاحب سے پوچھ لیں۔ اگر حاجی صاحب آپ کی اس داستان عقیدت سے آگاہ ہیں تو یہ بات راز نہیں بن سکتی۔ ہمارے اشتیاق کی آگ بجھائیے اور خود ہی اس راز نہاں کو عیاں فرمائیے۔

صاحبان عقیدت و محبت! بات دراصل یوں ہے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم رہا ہے کہ مجھے بچپن سے ہی اولیائے عظام سے عقیدت رہی ہے اور عمر کے ابتدائی حصے میں ہی کسی مرد کامل کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کی آرزو دل میں مچلنے لگی۔ میں کئی جگہوں پر گیا۔ مگر سکون قلب کی نعمت مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ غالباً یہ 1922ء یا 1923ء کی بات ہے جب کہ میری بے چینیاں عروج پر تھیں۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا مگر پڑھائی میں دل نہ لگتا تھا میں لاہور سے بھاگا اور سید ہاشم پور شریف میں آکر دم لیا کیوں کہ میں سن چکا تھا کہ یہاں ایک مرد قلندر اپنے فیض بے پایاں سے ایک دنیا کو مستفیض فرما رہا ہے میں بیٹھک میں دیگر حضرات کے پیچھے بیٹھ گیا۔ بابا دین محمد (خواجہ دین محمد) باری باری ان میں سے ہر ایک کو حضرت صاحب رحمۃ اللہ



علیہ کی خدمت میں بھیج رہا تھا مگر میری باری نہ آئی۔

جوانی کے جذبوں اور محبت کی آگ کے شعلوں نے اسے ناانصافی پر محمول کیا۔ اب میں بابا دین محمد سے زبردستی آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جانا چاہتا تھا مگر حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادم (بابا دین محمد) نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔ میں نے کچھ اپنی ترنگ دکھائی اور بازو سے پکڑے جانے کے باوجود آگے بڑھنے لگا۔ میں نے بازو چھڑا لیا۔ اور تیزی دکھائی۔ بابا دین محمد نے مجھے ٹانگ سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا چپت لگائی اور چلتا کیا۔

میں حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملے بغیر واپس گھر آگیا مگر بے چینیاں پہلے سے بھی زیادہ کھد کھد بھد کرنے لگیں۔ ایک رات میں نے نوافل ادا کئے۔ بغداد کی طرف منہ کیا اور عرض کرنے لگا۔

حضور میں آپ کی اولاد میں سے ہوں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا قدم تو اولیاء کے کندھوں پر ہے۔ مگر آپ کے اولیاء مجھے قریب نہیں آنے دیتے۔ آپ ان کو ذرا سمجھائیں نہ۔

یہ دعا کی اور سو گیا۔ صبح اٹھا تو دل پھر مضطرب تھا کس کے لیے؟ کہاں جانے کے لیے؟ کچھ پتہ نہیں تھا۔ دل جانا چاہا مگر طبیعت نہیں مانی۔ اجمیر شریف کا ارادہ کیا مگر مایوسی نے بے سہارا کر دیا۔ ملتان جانے کے بارے میں سوچا مگر دل نے نہ جانے کا مشورہ دیا۔ آخر شرقپور شریف کا خیال آیا تو بابا دین محمد کا ٹانگ کھینچ لینے کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اب کہاں جاؤں؟ جہاں بھی جانے کا قصد کرتا کوئی رکاوٹ سد راہ



بن جاتی۔ اسی ادھیڑ بن میں دن بیت گیا۔ رات کو سویا تو بغداد کی طرف سے اشارہ ملا کہ شرپور شریف میں ہی جاؤ۔ شرپور شریف والے ہی آپ کو اپنی منزل اور راہ کا پتہ بتائیں گے۔

صبح ہوئی تو شرپور شریف کی طرف منہ کر کے سفر کرنا شروع کر دیا۔ بیٹھک میں پہنچا تو وہی لوگوں کا ہجوم اور وہی بابا دین محمد۔ بابا دین محمد کا برتاؤ میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ بابا میری طرف دیکھنے لگا۔ میں ان کے نزدیک زیادتی کرنے والا تھا۔ اور وہ وہی میری ٹانگ کھینچنے والا۔ ایسے لگتا تھا آج پھر بابا دین محمد کے ساتھ مڈبھیڑ ہوگی۔ میں موقع کی تلاش میں تھا کہ بابا دین محمد کی بے دھیانی سے فائدہ اٹھاؤں مگر وہ بھی تو ولی اللہ کی بارگاہ کا خادم تھا۔ اس کی آنکھیں ہر جانب دیکھ رہی تھیں۔

آخر ایک بھاری بھر کم شخص کو بلایا گیا۔ میں اس کی اوٹ میں جانے لگا۔ بابا دین محمد کے قریب سے گزرا تو میں جس شخص کو اوٹ بنائے ہوئے تھا۔ اس کے آگے ہو کر بابا دین محمد کی آنکھوں سے او جھل ہو گیا۔ یوں میں نے نصف سیڑھیاں طے کر لیں کہ اچانک بابا دین محمد کی آنکھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ کچھ ہلکا سا بے ہنگم شور ہوا اور ایک آہنی ہاتھ نے میرے کندھے کو دبوچ لیا۔ میں نے چھڑانے کی کوشش کی مگر بے سود اتنے میں اعلیٰ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آواز آئی۔

”دین محمد! اسے آنے دو۔“

اب مجھے حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جانے کی اجازت مل گئی۔ میرے آنے پر آپ رحمۃ اللہ علیہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا آپ جس چیز کی



تلاش میں ہیں اس کا حصہ میرے پاس آپ کے لیے نہیں۔ بہر حال کچھ پڑھنے کو فرمایا اور میرے سینے پر انگلی لگائی۔ یہ انگلی کیا تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ بجلی کے کسی ننگے تار سے لگ گیا ہو۔ میرے جسم کا رو گنگٹارو گنگٹا ایستادہ ہو گیا۔ میری آنکھوں نے وہ کچھ دیکھنا شروع کر دیا جو ان سے اوچھل تھا۔ پھر فرمایا آپ جائیں اور یوں حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ سے میری شکایت نہ کیا کریں اس دن آپ آئے اور مجھ سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ بابا دین محمد آپ کے سد راہ بنا۔ آپ کو آنے اور واپس جانے کی تکلیف ہوئی میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

میں گھر چلا گیا۔ اس رات مجھے خواب میں بشارت ہوئی کہ ماموں کانجن کے حضرت صاحب مجھے بلا رہے تھے۔ ایک دو دن کے بعد ماموں کانجن گیا تو حضرت صاحب میرے منتظر تھے۔ فرمانے لگے بڑی سفارشوں کے سہارے یہاں پہنچے ہو۔ آپ (پیر سید شوکت حسین شاہ صاحب) نے مجھے بیعت فرمالیا اور پھر خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔ حضرت حاجی فضل الہی مونگہ نے کسی محفل میں آپ سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ کے پیر صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا نہیں حاجی صاحب میں اپنے پیر صاحب سے آپ کی ملاقات نہیں کرواؤں گا۔ آپ جب انہیں دیکھیں گے تو آپ بعض باتوں میں معترض ہوں گے۔ آپ کے یہ اعتراض بجا ہوں یا بے جا مجھے ناگوار گزریں گے اور پھر یقیناً ”یہ ناگواری ہمارے محبت ریز روابط میں ایک خلیج حائل کر دے گی۔“

راوی حاجی فضل احمد مونگہ شرپوری (مصنف حدیث دلبراں)

ماہنامہ نور اسلام، اگست 1995ء



دَوْرِ جَدید کے مسائل کے حل کے لیے عصرِ حاضر کے  
 مفکرین کے قلم کی نگارشات کا مطالعہ زندگی کے ہر  
 شعبہ کے ہر فرد کے لیے از بس ضروری ہے  
 بیضانِ کرم ضیاءِ الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ لازہری دامت برکاتہم العالیہ

## ہم اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں!

- |  |                                       |
|--|---------------------------------------|
| ○ غازی علم دین شہید                                      | ○ رُوحانی شفا خانے                    |
| ○ نورانیت مصطفیٰ   | ○ فیض کے چشمے                         |
| ○ سازشوں کا دیباچہ (قادیانیت)                            | ○ مقرر بنیے                           |
| ○ بات سے بات   | ○ رموزِ خطابت                         |
| ○ بنتِ حوا   | ○ طلباء کی تقریریں                    |
| ○ حقیقتِ استمداد   | ○ کربلا معنوی تحقیق کے آئینے میں      |
| ○ جبر و قدر  | ○ علومِ نبوت                          |
| ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور ہماری زندگی | ○ مسئلہ امانت رسول صلی اللہ علیہ وسلم |
| ○ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء                        | ○ اختیاراتِ نبوت                      |
|  | ○ امراءِ بدر و فقراء                  |

اور ایسی بے شمار کتب  
 آپ کے میز کی زینت

کرم پبلی کیشنز ۲۰ سٹر مارکیٹ، چوک اردو بازار، لاہور



7230515





فی تصوف کا عظیم شاہکار

# چشمہ فیض شریانی

حالات و تعلیمات

تالیف

محمد حسین قصوری نقشبندی

ناشر

ادارہ علم و ادب، والٹن، لاہور

ملنے کا پتہ:

ضیاء القرآن پبلیکیشنز گنج بخش روڈ، لاہور

بذریعہ ڈاک منگوانے کا پتہ:

مرکز میلاد، مدینہ سٹور، نزد ریحیہ سٹور کراچی

غازی روڈ لاہور



فی تصوف کا عظیم شاہکار

# چشمہ فیض شیرازی

حالات و تعلیمات

تالیف

محمد حسین قصوری نقشبندی

ناشر

ادارہ علم و ادب، والٹن، لاہور

ملنے کا پتہ:

ضیاء القرآن پبلیکیشنز گنج بخش روڈ، لاہور

بذریعہ ڈاک منگوانے کا پتہ:

مرکز میلاد، مدینہ سٹور، نزد ریجرز سٹور کراچی

غازی روڈ لاہور